گلِ نغماتِ تذکرہ فن تماشائے تذکرہ

زندگانی بے نظیر

یعنی

سوانح عمری نظیرؔ

جس میں نظیر اکبر آبادی کے حالات و خیالات سے انگریزی اصول تذکرہ نویسی پر تفصیلاً بحث کی گئی ہے

تالیف

نازک خیال بلند پرواز جناب مولوی سید محمد عبد الغفور صاحب شہباز

پروفیسر اورنگ آباد کالج

مطبع منشی نولکشور میں حسب طبع آنریبل منشی (؟)

لکھنؤ سنہ ۱۹۰۰ء

25 June 1907

فہرستِ مضامینِ زندگانیِ بے نظیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ سوانحِ عمری نظیر

اللہ اللہ! وہ بھی کیا دن تھے - میری صبحِ زندگانی تھی اور مہر پدری کا آغازِ طلوع - ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور دھیمی دھیمی شعاعیں پھیل رہی تھیں تفہیم کے جھکولوں سے شاخ و برگ پڑے جھوم رہے تھے تعلیم کے دریچے سے میں گلستان بوستاں کی سیر کر رہا تھا - بیل بوٹوں سے آنکھوں کو تازگی حاصل ہوتی تھی اور پھول پتیوں سے دماغ معطر ہوتا تھا - اِسی عالم میں جنابِ والدِ ماجد کے گلبنِ حافظہ پر کسی روز نظیر کا بلبلِ طبع چہکا - نغمہ یہ تھا -

	گر شال اُڑھائی تو اُسی شال میں خوش ہیں پورے ہیں وُہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں	

میٹھے سُر اور پیارے بول - وجد ایک امرِ ضروری تھا - کچھ کہہ نہیں سکتا کہ اِس نغمے نے کیا مزہ دیا؎ - وہ صدا آج تک کانوں میں گونج رہی ہے اور خالی از لطف نہیں - بلبل تو چہک کر اُڑ گیا مگر نول اب تک دل میں گڑی ہوئی ہے -

یاد پڑتا ہے اُنھیں دنوں میں یہ زمزمہ بھی سُننے میں آیا تھا -

؎ غالباً یہ سنہ ۱۲۸۶ھ یا ۱۸۶۹ء کا واقعہ ہے -

عاشق ہی تو مولیٰ کو ہر اک رنگ میں پہچان

اور شاید یہ برڈن آو سونگ[۱] بھی :-

سب ٹھاٹھ[۲] پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا[۳]

ایک گلابی ورق پر نستعلیق ترکیبوں سے یہ خط و خال بھی سُرمہ کشِ نظر ہوئے تھے۔

خدا اگر مجھ گدا کو سلطنت بخشے تو ای یار و
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
نظیرؔ اِس طرح سے تضمین کر تو مصرعِ حافظ
کہ بر نظمِ تو افشاند فلک عقدِ ثریّا را

مقبولیت نے جو تخمِ مزرعِ دل میں نصب کیا تھا مدّتوں نسیان اور تغافل کے پتھر کے نیچے دبا رہا۔ جب کلکتے[۴] میں اڈیٹری نے میرے لیے کرسی خالی کی تو وہاں بعض عنایت گستر ہاتھوں نے اُس پتھر کو ہٹایا اور اُس تخم کو ازسرِ نو پھلنے پھولنے کا موقع ہاتھ آیا۔

اخبار جس کا میں اڈیٹر تھا چوں کہ ہندوستان کے انگریزی دار السلطنۃ سے نکلتا تھا اور بادشاہ کمپنی کے زیرِ اہتمام لہٰذا دار السلطنۃ کہلاتا بھی تھا۔ اس کے مالک معمولی تعلیم کے پنجابی تھے۔ پڑھے لکھوں کی صحبت میں بیٹھتے اُٹھتے چشمِ بددو

۱ برڈن آو سونگ انگریزی میں آستائی کو کہتے ہیں۔ چونکہ ٹیپ بھی آستائی کا کام دیتی ہے لہٰذا اُس پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ یہ انگریزی اصطلاح اس مقام پر بغرضِ لطفِ ایہام لائی گئی ہے۔

۲ ٹھاٹھ = اسباب۔ مال و متاع۔ دھن دولت۔ جائداد۔

۳ بنجارا۔ اناج کی سوداگری کرنے والا۔ ایک قوم کا نام جو غلے کی سوداگری کرتی ہے۔ سوداگر۔ بیوپاری۔ مثل۔ بیچے سو بنجارا۔ رکھے سو ہتیارا۔

۴ مابین ۱۸۸۸ء و ۱۸۹۱ء

کچھ پڑھنا لکھنا سیکھ گئے تھے۔ ایک دن سڑک پر کوئی خوش آواز فقیر نظیر کا کلام (شاید کوڑی نامہ) صدا میں پڑھتا جا رہا تھا۔ سُن کر بے ساختہ اُن کی زبان سے یہ فقرہ نکلا۔ "اس شخص کا کلام بھی کتنا پاکیزہ ہوتا ہے" اُسی دن سے نظیر کی طرف پھر کر بڑے زور سے خیال رجوع ہوا اور آج تک رجوع ہے۔ اُسی زمانے سے پھر یہ معمول ہوا کہ جب کوئی کلام نظیر کا نظر سے گزرتا شوق سے دیکھتا، توجہ سے اُس کے مطالب پر غور کرتا، اور دل سے محظوظ ہوتا۔ جس قدر زیادہ اِس کا کلام پڑھتا گیا اُس کی عظمت بڑھتی گئی۔

جنوری ۱۸۸۷ء میں جب بیمار ہو کر کلکتے سے گھر آیا تو اُن دنوں مجھ کو اس کے کلام سے خاص عشق تھا۔ اتفاق سے مکان پر چند نامے نظیر کے ایک کتاب میں مجلد ملے۔ عبدالرحمٰن خان شاکر نے بعض دیندارانہ اور عقیدت مندانہ خیال سے اُن کو انتخاب کر کے نیلگوں کاغذ پر یکجا چھپوایا تھا۔ یہ مجموعہ وہی تھا جو جناب والد کے ہاتھ میں میں نے کسی زمانے میں دیکھا تھا۔ بڑے شوق سے دیکھا اور نہایت دل لگا کر اُس کی بندشوں اور خیالات کو اخذ کیا۔ جا بجا بعض عیوب بھی تھے مگر خوش عقیدگی کی نظر بندی سے اصلا نظر نہ آئے۔ کسی شاعرِ عرب نے سچ کہا ہے:۔

وعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ

نظیر کے دامن میں جہاں کہیں دھبے نظر آتے تھے متقدمین کی نظیریں صابون بن کر صاف دھو دیتی تھیں۔

میرے بزرگوں میں ایک مولوی ہو گزرے ہیں۔ اکرم علی اُن کا نام تھا اور گوہر تخلص۔ طبیعت رسا رکھتے تھے اور اشعار آب دار نکالتے تھے۔ ایک روز میں اُن کے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ اُن میں کچھ اوراق ایسے بھی نکلے جن میں نظیر کے بہت سے اشعار، مشہور غزلیں، اور منتخب نامے درج تھے۔ اُن اشعار سے جہاں قائل کی خوبی اور انتخاب کرنے والے کا سلیقہ ظاہر ہوا ایک عقدہ یہ بھی حل ہوا کہ نظیر کا کلام جہاں ملتا تھا شعرا اپنے ذہن کو قوت اور طبیعت کو فیض پہنچانے کے لیے بطورِ یادداشت غنیمت جان کر لکھ لیا کرتے تھے اور مدتوں نقلِ محفل رکھتے تھے۔

یوں ہی درجہ بدرجہ نظیر کی مقبولیت ترقی کرتی گئی یہاں تک کہ دو ایک نظمیں بھی میں نے اُس کی تقلید میں لکھیں مثلاً اتفاق نامہ، آئینۂ تہذیب۔ جب تدریج میں نظیر کا صد سے زیادہ معتقد ہوا تو طبیعت اُس کے حالات کی جویا ہوئی۔ صدہا تذکرے کل اُلٹ ڈالے مگر تفصیلِ خاطر خواہ ہر جگہ عنقا۔ دوسرا ہوتا تو ہار کر بیٹھ رہتا مگر دل کی لگی بُری ہوتی ہے دل اس پر بھی خواہ مخواہ اپنے ارادے پر اڑا رہا کہ نظیر کے سوانح عُمری مرتب کیے جائیں، اور مفصّل مرتب کیے جائیں اور تذکرہ نویسوں کی بدخیالی سے اِس ناصحِ شفیق پر جو ظلم ہوئے ہیں وہ مٹائے جائیں، اور بزور مٹائے جائیں کسی شاعرِ ہندی نے کیا خوب کہا ہے:

جن ڈھونڈا تن پائیاں، گہرے پانی پیٹھ۔

تلاش میں بڑی برکت ہے۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے آخر اتنے حالات ملے کہ خود میرے خیال میں بھی نہ تھے۔ سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہ تھا کہ نظیر کا کُلیات لکھنؤ سے منگوایا اور نہایت غور سے اُس کا مُطالعہ کیا۔ ہر نظم سے ایک نتیجہ اُس کے حالاتِ زندگی کے متعلق نکالا اور ہر شعر سے اُس کے کلام کی خوبی کے وجوہات مستنبط کیے۔

کلیات جو ہاتھ آیا زمانۂ موجودہ کی نفاست پسندی اور قطع و برید قانونی کی وجہ سے ناتمام تھا۔ مخدومِ اکبر حکیم اصغر حسین فرخ آبادی کی عنایت سے مطبعِ احمدی آگرہ کے نسخے نے اِس داغِ ناتمامی کو مٹایا۔

پہلے جو کُلیات آیا تھا وہ مُنشی نولکشور کے مطبع کا تھا۔ دل نے کہا مُنشی صاحب ہی سے خط و کتابت کرو۔ کُلیات چھاپا ہے۔ شاید بعض جزئی حالات بھی جانتے ہوں مُنشی صاحب کو جو خط گیا تھا اُس کا جواب مُنشی جالپا پرشاد صاحب نے عنایت کیا۔ خط میں منجملہ اور مضامین کے ایک مضمون یہ بھی تھا کہ میاں نظیر ہر سال فرخ آباد کو جایا کرتے تھے۔ فرخ آباد کے تعلق نے حکیم صاحب کی طرف ذہن کو منتقل کیا۔ انھوں نے اپنے داماد احمد علی خاں کا پتا دیا جو اُن دنوں آگرے میں

* سکریٹری اودھ اخبار لکھنؤ۔
* نمبری ۱۸۸۲ - مورخہ ۱۱ - جولائی سنہ ۱۹۱۸ء
* بذریعہ مراسلہ ۲۶ - اکتوبر سنہ ۱۹۱۸ء از فتح گڑھ ضلع فرخ آباد
* انسپکٹر کاب گنج آگرہ۔

تشریف رکھتے تھے۔ احمد علی خاں نے میرزا نوازش علی بیگ کا نشان بتایا جو میاں نظیر کی نواسی کے اکلوتے داماد ہیں۔ میرزا نوازش علی بیگ سے معلوم ہوا کہ میاں نظیر کی نواسی ابھی جیتی جاگتی ہیں اور میاں نظیر کے بہت سے حالات اُن کو معلوم ہیں۔ غرض یوں سلسلہ بسلسلہ اصل چشمۂ مقصود تک پہنچا، اور پہنچا تو سیراب بھی ہوا۔

جون ۱۹۳۰ء میں ایک ضرورت سے میں آگرے گیا ہوا تھا۔ اُسی زمانے میں، بیک کرشمہ دو کار، میرزا نوازش علی بیگ کی نوازش سے بھی فائدہ اُٹھایا۔+ اُن کی خوش دامن سے بھی مل کر خوش خوش دامنِ مقصود بھر لایا۔ میاں نظیر کے مزار کی بھی زیارت ہوئی۔ اُن کی غیر مشتہر تصانیف سے چار پانچ کتابیں بھی ہاتھ آئیں۔ میاں غلام محمد رہا ہنوز قیدِ حیات سے آزاد نہوے تھے، اُن سے بھی کچھ استفسارات رہے۔ استفسار کی یہ ابتدا تھی مگر پھر تو اس کا سلسلہ اِس قدر بڑھا کہ جو شخص آگرے کی طرف کا ملتا اُسی سے کچھ نہ کچھ حالات دریافت کر لیتا۔ فقیر بھیک مانگنے آیا ہی۔ لب و لہجے سے آگرے کا معلوم ہوا۔ بٹھا کر اُسی سے کچھ باتیں پوچھ لیں۔ کوئی سیاح صاحب کتابیں بیچتے ہوے تشریف لائے ہیں۔ اکبر آباد کی بہت باتیں بیان کرتے ہیں۔ آکر اُنھی سے کچھ حقیقت دریافت کر لی۔ جب لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ میں اس قدر نظیر کے حالات کا جویا ہوں تو بعض اشخاص خود بے پوچھے بھی بتانے لگے۔

چوں کہ نظیر کے مزاج پر موزونی کے ساتھ مزاح بھی غالب تھی تو خاص اِس پہلوے طبیعتِ انسانی کی تحقیق کے لیے اپنے زمانے کے بعض قدیم نمونۂ طباعی و ظرافت کی بھی مدتوں صحبت رکھی اور اُن کے اخلاق و عادات حرکات و سکنات کا برسوں دوربینِ تحقیق سے مشاہدہ کیا۔ غرض بقول سعدیؒ

تمتع زہر گوشۂ یافتم زہر خرمنے خوشۂ یافتم

+ سب انسپکٹر لوہا منڈی۔ آگرہ۔
+ بذریعۂ مراسلہ ۲۹-اکتوبر ۱۹۲۹ء
+ بذریعۂ خط و بالمشافہہ۔

ماخذ تو اس قدر قلیل مگر کتاب باعتبار مضامین خاصی عمرو عیار کی زنبیل! اسکا سارا بھید بند ہے دو لفظوں میں تفتیش اور تخییل۔ تفتیش نے تخییل کو اُبھارا تخییل نے تفتیش کو چمکایا۔ دونوں ملکر مضمون کو لے اُڑیں ہ

واں پہنچی ہے فریاد کہ لپٹے نظر آئے
دُم دار ستارے، کئی، فریاد کی دُم میں

رباعی

کیا اک تمیس نور کی دکھائیں قمری
ہر دم جو پڑی الاپتی ہے ٹھمری
شہباز کے ہاتھ میں وہ قُمری ہے قلم
ٹھمری ہے نظیر کی سوانح عُمری

اشتہار میں اس کتاب کا نام نظیر نامہ مشتہر ہوا تھا اس خیال سے کہ نظیر مشہور ناموں ہی سے ہے۔ مگر اتفاق سے بعض تاریخی نام ایسے عمدہ نکل آئے ہیں کہ اُن کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ تاریخ کہتی ہے۔ زندگانی بے نظیر۔ کہو۔ یا اکبر آباد کے نظیر کی سوانح عُمری۔ اشتہار کہتا ہے نظیر نامہ سے بہتر کوئی نام نہیں۔ تجویز کش مکش میں ہے۔ اشتہار اور تاریخ کی کش مکش میں "دل آویز" بیچ بچاؤ کو اُٹھ کھڑا ہوا اور پاؤں پڑ کر دونوں کو راضی کر لیا۔ اب چاہے "نظیر نامہ دل آویز" کہہ لیجیے چاہے "زندگانی بے نظیر" چاہے "اکبر آباد کے نظیر کی سوانح عُمری"۔ ایہام کا فتویٰ ہے:۔

خیر الامور اوسطہا۔

اچھا یہی سہی۔

جام باغ۔ حیدرآباد دکن۔ ۲۰-۸-۱۹۶۰ ● دیباچہ طراز
محمد عبدالغفور شہباز

نظیر کی پیدائش

محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ ہو اور شہر میں رنگ رلیاں نہ منائی جائیں کوئی کہنے کی بات ہے۔ در و دیوار سے رنگ ٹپکتا تھا اور گلی گلی سے راگ اُبلتے تھے۔ لال قلعہ لالوں لال تھا اور چاندنی چوک مالا مال۔ لیکن عام قاعدۂ قدرت کے مطابق اُس راگ رنگ کے زمانے میں بھی بعض گھر نوحہ و شیون سے خالی نہ تھے۔ ہر چند زمانہ بہت گزر گیا ہے مگر خیال کی دوربین آنکھوں سے ہم اب بھی دیکھتے ہیں کہ شہر کے کسی گوشے میں خوش وقت ہمسایوں سے گھرے ہوئے گھر میں دو نیک بختیں نہایت ملول بیٹھی ہیں اور رفع ملال کی کچھ نسوانی معصومانہ تدبیریں سوچ رہی ہیں۔ بڑی بی کی پیشانی اور بھنووں پہ توہم نے ایک خاص کھنچاوٹ پیدا کر رکھی ہے۔ صاحبزادی کی آنکھیں گو اشک بار نہیں مگر پُرنم ضرور ہیں۔ غم کی تصویر کوئی نقاش اس سے بہتر کھینچ نہیں سکتا۔ نگاہ بارِ غم سے اُٹھتی نہیں۔ ہر وقت جھکی ہی رہتی ہے۔ رنگت گو زرد نہیں ہے مگر پھیکی ضرور پڑ گئی ہے۔ خون آہستہ آہستہ جسم میں گھٹ رہا ہے۔ بعض وقت گزشتہ مصیبتیں یاد آ کر دل کو بے چین کر دیتی ہیں۔ یکایک رنگ فق ہو جاتا ہے اور دفعۃً آنکھوں سے غم آلود مگر خوشنما آنسوؤں کا سلسلہ جاری ہو پڑتا ہے۔ عاشقِ زار ماں یہ منظر دیکھ نہیں سکتی۔ وہ بھی بلبلا اُٹھتی ہے اور پھر ساون بھادوں مل کر برسنے لگتے ہیں۔ بلکہ ع

یوں نہ برستے دیکھے ہوں گے کسی نے ساون بھادوں

لونڈی مامائیں یہ سماں دیکھ کر ہمدردی کے رومال لے کر دوڑتی ہیں اور دل سوزی کے ہاتھ سر پہ رکھ کر خیر خواہی سے آنسو پونچھتی ہیں۔ آنسو تھمتے ہی پاس پڑوس کے اور مصیبت مندوں کا ذکر چھڑ جاتا ہے اور جھاڑ پھونک اور دعا تعویذ کے تجربے بطور علاج بیان ہونے لگتے ہیں۔ مُلّا سیانوں درویشوں مجذوبوں کی زندہ کرامتیں ایک نہیں بیسیوں چشم دید شہادت کے ساتھ بڑے زور سے مذکور ہوتی ہیں۔ بو علی قلندر اور نظام الدین اولیا اور قطب صاحب اور نصیر الدین چراغ دہلی اور شاہ سرمد کی اولاد بخشی کی نظیریں سیکڑوں پیش کی جاتی ہیں۔ خوش اعتقاد نیک بختیں پہلے بے اعتنائی سے سنتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اُن کی توجہ اُدھر زیادہ مُڑنے لگتی ہے۔ پھر ہر بات وحی اور الہام کا رتبہ بہم پہنچاتی ہے اور آخر یہ ہوتا ہے کہ بڑی بی بڑے اصرار سے فرماتی ہیں کہ خدا کے لیے میری بچی کے لیے بھی کوئی تدبیر سوچو بلکہ ہو سکے تو آج ہی فلاں شاہ صاحب کے ہاں جاؤ اور اُن کو خدمت سے خوش آمد سے منت سے سماجت سے جس طرح بنے ہمارے حال پر مہربان کرو۔

یہ دو نیک بختیں جن کا ابھی ذکر ہوا گو اُس وقت نہ ہوں مگر اب تو یقیناً نظیر کی ماں اور نانی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نظیر کی ماں کی اولادیں زندہ نہ رہتی تھیں۔ بارہ اولادیں ہوئیں اور بارہوں مر مر گئیں۔ دل کا ایک ناسور بہت ہوتا ہے۔ جب بارہ ہوں تو پھر اُس دل کے درد اور ٹیس کا کیا پوچھنا ہے۔ نسوانی تدبیریں زیادہ فوق العادۃ اُمور سے متعلق ہیں۔ ماما دائیوں کے ذریعے سے ایسی تدبیریں ایک نہیں سیکڑوں کی گئیں مگر کوئی بکار آمد نہ ہوئی۔ تجسّس کے سلسلے میں ایک بزرگ ایسے بھی ملے جنھوں نے ماما کی زبانی نظیر کی نانی کو کہلا بھیجا کہ لونڈی ماماؤں کو کیا بھیجتی ہے۔ کام چاہتی ہے تو داماد کو بھیج۔ محمد فاروق نام کے اعتبار سے جو کچھ ہوں مگر معمولی تعلیم کے آدمی تھے۔ بارہ اولادیں کھو چکے تھے۔ ایک معتقد علیہ اور مشارالیہ فقیر کا جو یہ پیام سُنا سر کے بل دوڑے اور آنکھوں سے وہ پھول اُٹھا لائے جو فقیر نے اُن کو اپنے گلشنِ کرامات سے عنایت کیے۔ یہ پھول گنتی میں پانچ تھے۔ فقیر کی ہدایت تھی کہ اُن کو سونگھ کر دریا میں ڈال دینا

اور جو کیفیت اِن پھولوں کی ہو پھر مجھ سے کہہ جانا۔ عقیدت میں شور بور جمنا کنارے پہنچے اور ایک خوشگوار تشویش کے ساتھ اُن پھولوں کو پانی میں پھینکا۔ ان میں سے صرف ایک پھول تو سیدھا پڑا باقی سب پٹ۔ یہ خبر لے کر پھر فقیر کے پاس پہنچے۔ فقیر نے بشارت دی کہ جا خوش ہو ایک لڑکا تیرا زندہ ہوگا زندہ رہے گا اور تیرے نام کو زندہ کرے گا۔ قابلیت اُس کی غنچے کی طرح شگفتہ ہوگی اور خوشبو اُس کی پھول کی طرح تمام پھیلے گی۔

حسنِ اتفاق یہ کہ اسی کے بعد آثارِ حمل بھی ظاہر ہوئے۔ عقیدت دوبالا ہوگئی۔ نویں مہینے میاں نظیر دبستانِ عدم سے مکتبِ ظہور میں آئے۔ چوں کہ کئی اولادوں کو ہار کر ہوئے تھے۔ جرم سنگین تھا۔ لہذا ناک کے ساتھ دونوں کان بھی چھیدے گئے۔ اس سزا پر معصوم آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ بطورِ عذرِ گناہ خوش تر از گناہ ناک میں بُلاق ڈالا گیا۔ کانوں میں دُر لٹکے۔ بُلاق نے نتھنوں سے سرگوشی شروع کی۔ دُر نے خدا جانے کانوں میں کیا پڑھ پھونکا۔ زینت لے اُڑی۔ بھولا پن منہ دیکھتا رہ گیا۔

نظیر کی طفولت

ڈیڑھ پونے دو سو برس قبل لڑکوں کی پرورش اور تربیت کا کیا ڈھنگ تھا اُس کا بیان اس وقت میں آسان نہیں ہی۔ لیکن ازبس کہ ہمارے ہندوستانی بھائی کنسرویٹو[۱] خیالات کے ہیں اور دستورِ قدیم کو چھوڑنا بہت کم پسند کرتے ہیں اس لیے قیاس چاہتا ہی کہ قریب قریب کُل باتیں یہی ہوں جو اب رائج ہیں۔ زچہ خانے سے لے کر مکتب کے زمانے تک ساری باتیں وہی ہوں گی جو اب ہر شریف گھرانے میں دیکھی جاتی ہیں۔ چھٹی، چلہ، تارہ دکھائی، بگیر بچہ وغیرہ خدا جانے کیا کیا رسمیں ہوتی ہیں کون کہہ سکتا ہی کہ نظیر کی پیدائش میں یہ سب باتیں نہ ہوئی ہوں گی۔ نظیر پیدا ہوا ہوگا تو کیا اُس کی بزرگ عورتوں نے اُس کے لیے کپڑے اور زیور نہ بھیجے ہونگے؟۔

جب نظیر پیدا ہوا ہوگا تو کیا محلّے اور قرابت کی عورتیں جمع نہ ہوئی ہونگی؟۔ کیا ڈھول مجیرے لے کر میراثنیں نہ پہنچی ہونگی؟۔ کیا زچہ گیریاں نہ گائی ہونگی؟۔ کیا لوگوں نے دعائیں نہ دی ہوں گی؟۔ کیا بچّے کی صورت شکل

[۱] کنسرویٹو یعنی قدیم دستور پر اڑے رہنے والا گروہ جو پُرانی باتوں کا چھوڑنا اور نئی باتوں کو اختیار کرنا بہت کم پسند کرتا ہی۔ سر لیپل گریفن نے ہندوستانیوں کے کنسرویٹزم یعنی قدامت پرستی کو ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو کے کسی پرچے میں نہایت مدلّل اور خوش گوار طریقے سے ثابت کیا ہی۔

[۲] زچہ خانے کا ساماں کنھیا جی کے جنم میں خود نظیر یوں بیان کرتا ہی:۔

سب ناری آئیں گونے کی اور پاس پڑوسن آ بیٹھیں
کچھ ہر دم مکھ اُس بالک کا بلہاری ہو کر دیکھ رہیں

کچھ ڈھول مجیرے لاتی تھیں، کچھ گیت جچا کے گاتی تھیں
کچھ تھال نیجری کے رکھتیں، کچھ سونٹھ سنٹھورا کرتی تھیں

کچھ کہتی تھیں "ہم بیٹھے ہیں نیگ آج کے دن کا لینے کو"
کچھ کہتیں "ہم تو آئے ہیں آنند بدھاوا دینے کو"

اور قوی پر رلے زنی نہ ہوئی ہو گی ؟- کیا لوگوں نے زچا و بچہ کو دعائیں نہ دی ہوں گی ؟- کیا دائی دُہرا انعام نہ مانگتی ہو گی ؟- کیا پنجیری کے تھال طیار نہ ہوئے ہوں گے ؟- کیا سونٹھ سنٹھورے کا سامان نہ ہوا ہو گا ؟- کیا بھانڈ بھگتیے اور ہیجڑے آ جمع نہ ہوئے ہوں گے ؟-

عورتوں اور اُن کی رعایت خاطر سے مردوں نے جو خوشی نیگ جوگ کے دینے لینے میں ظاہر کی ہو گی اور اِس مولودِ مسعود کے ہونے کی خوشی میں باجے گاجے سے کام لیا ہو گا اُس کا تصور ہر شخص اچھی طرح کر سکتا ہے- لیکن عاقل اور دور اندیش عورتیں کم اور مرد زیادہ اُس لڑکے کے تیور سے اُس کی ذہانت اور فطنت استنباط کرتے تھے اور اُس کی ہر ادا سے سمجھتے تھے کہ لڑکا ہونہار ہے- آنکھیں بڑی ہوں یا چھوٹی لیکن اُن کی گردش- اُن کی چمک- پلکوں کی نرمی اور باریکی دکھاتی تھی کہ اُن چھوٹی کھڑکیوں سے ذہانت اور تیزی جھانک رہی ہے- بھنویں جُتی ہوں یا علیحدہ مگر اُن میں بال ایک انداز سے اُگے ہوئے تھے اور آنکھوں کی چودہ ورق کی کتاب کی فہرست نہایت اختصار کے ساتھ اپنی بغل میں دبائے ہوئے تھیں- سر بڑا نہ تھا تو

کوئی گھُٹی بیٹھی گرم کرے، کوئی ڈالے اسپند اور بھوسی
کوئی دیکھے روپ اُس بالک کا، کوئی ماتھا چومے مہر بھری
کوئی لائی ہنسلی اور کھڑوے، کوئی کُرتہ، ٹوپی، میوہ، گھی
کوئی بھنووں کی تعریف کرے، کوئی آنکھوں کی، کوئی پلکوں کی

کوئی کہتی "عمر بڑی ہووے اے بیر تمہارے بالے کی"
کوئی کہتی "بیاہ بہو لاؤ اِس آس مرادوں والے کی" الخ

ہر چند یہ سامان ہندوؤں کے ہاں کا ہے لیکن مسلمانوں نے اکثر اِس قسم کی باتیں ہندوؤں سے اخذ کی ہیں اس لیے اِن کے ہاں کا سامان بھی قریب قریب یہی ہے۔ اکبر آباد میں قاعدہ ہے کہ جب کسی گھر میں بیٹا ہوتا ہے تو یہ لوگ اپنی ڈھولک و دلکے کر آن موجود ہوتے ہیں اور گا بجا کر انعام طلب کرتے ہیں- یہ ہم لوگوں کے دیار کے ہیجڑے کی جگہ ہیں-

بیٹا ہوا کسی کے جو سُن پائیں ہیجڑے
ناچیں بجا کے تالیاں اور گائیں ہیجڑے
سُنتے ہی اُس کے گھر میں پھر آ جائیں ہیجڑے
لے لے کے بیل بھاؤ بھی بتلائیں ہیجڑے

اُس کے بڑے نصیب جہاں آئیں ہیجڑے

چھوٹا بھی نہ تھا۔ متوسط درجے کا لیکن اس اُصول ہندسی پر بنا ہوا تھا کہ اکثر عمدہ قوائے ذہنی کو اُس میں فراغت کی جگہ ملی ہوئی تھی۔ ناک بلند تھی اور اُس کی بلندی پر غیرت اور عزتِ نفس ننھی ننھی کرسیاں بچھائے بیٹھی تھی۔ ٹھوڑی اعتدال کی تھی۔ نہ بہت مختصر نہ بہت نکلی ہوئی۔ پیشانی چوڑی اور اونچی جس سے سیر چشمی ٹپکی پڑتی تھی۔ سینہ بہت چوڑا تھا جس سے فراخ حوصلگی کا اندازہ ہوتا تھا۔

یہ تصویر جو ہم نے کھینچی ہے نظیر کے اخلاق کے آئینے سے لی گئی ہے۔ اُس کی نواسی کا دیا ہوا فوٹو[۱] آگے چل کر پیش ہوگا۔

نظیر چوں کہ خاندان قریش سے تعلق رکھتا ہے اور قاعدہ ہے کہ قریشی عموماً سیاہ فام نہیں ہوتے غالباً اُس کا رنگ گندم گوں ہوگا۔ گویا اُس کی رنگت بھی اُس کی آدمیت کی شہادت دیتی تھی۔ قد کو بہت پست نہیں کہہ سکتے کیوں کہ اُس کی کسی تحریر سے اُس کا مکر وفن یا میلان فتنہ پردازی ثابت نہیں ہوتا۔ نہ بہت ہی طول بتا سکتے ہیں اس لیے کہ حماقت کی جھلک بھی اُس کی کسی تحریر میں نہیں ہے۔ متوسط درجے کا قدو قامت ہوگا۔

جس زمانے میں نظیر ماں کی یا دائی ددا کی گود میں یا بچھے پر یا پالنے میں پڑا رہتا تھا اُس زمانے میں بھی لوگ دیکھتے تھے کہ وہ اپنی ذہانت سے کس طرح کام لے رہا ہے۔ مضغۂ گوشت محض۔ بے چارہ زیادہ ہل ڈل تو نہیں سکتا تھا لیکن چت پڑا ہے تو اُسی حالت میں چھت سے نظر جائے کبھی کڑیوں کی حالت پر غور کر رہا ہے، کبھی شہتیر اور کڑیوں میں امتیاز کے اسباب تجویز کر رہا ہے۔ رنگ اور بو اور آواز کے نکات میں غلطاں پیچاں ہے۔ پتلیاں اُس کی آنکھوں میں بعض وقت بڑی سُرعت سے گردش کرنے لگتی ہیں، بعض

[۱] عکسی تصویر۔

وقت غور و فکر کے ٹھہرانے سے انتہا سے زیادہ ٹھہر جاتی تھیں۔ جاگتے وقت وہ اکثر فطرتی بے چینی سے گھڑی بھر میں سیوں پہلو بدلتا اور اکثر چیزوں جس تک اُس کا ہاتھ پہنچتا اُن پر بار بار ہاتھ پہنچاتا اور ہر مرتبہ ایک نئی بات سیکھتا۔ ازبس کہ شگفتہ مزاج پیدا ہوا تھا زیادہ لوگ اُس کو روتا نہ دیکھتے۔ اکثر مُسکراتا اور ہنستا رہتا اور اگر مرض کی کوئی شکایت نہیں ہی تو پاخانے پیشاب اور بھوک پیاس کی اوقات کے علاوہ لوگ اُس کو کبھی روتے نہ دیکھتے۔ اچھی صورتوں کا امتیاز اور اچھے لوگوں کی تمیز اُس کو لڑکپن ہی سے تھی۔ خوب صورت اور صاف ستھرے آدمیوں کی گود میں شوق سے جاتا اور جن کو میلا دیکھتا یہاں تک کہ جنکے چہرے پر ڈاڑھی کچھ بہت بے قاعدہ گھنی ہوتی اُن کی گود میں جاتے گھبراتا اور رو کر جلد الگ ہو جاتا۔ اس کے لب و دہن کی ساخت ایسی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ جلد بولنا سیکھے گا۔ نہ زبان موٹی نہ ہونٹھ موٹے۔ دونوں انداز کے۔ مسوڑھوں اور دانتوں کی ساخت سہولتِ تلفظ کے مناسب حال۔ تھوڑے ہی دنوں میں مم۔ بپا۔ اماں۔ ابا وغیرہ کہنے لگا اور بہت جلد معمولی الفاظ اپنے مطلب کے اُس کو یاد ہو گئے۔ اخذ اور حافظے کی قوت اتنی قوی تھی کہ جو بات سُنی نقش کالحجر ہو گئی۔ ہر چند ایک زمانے تک بعض مخارج اس سے ادا نہ ہوتے تھے جیسے ر ڑ ش وغیرہ مگر اس نقص میں اُس کے بھولے پن نے وہ کمال پیدا کر دیا تھا کہ صحیح تلفظ اُس پیارے پیارے ننھے مُنے مخارج کے ایجاد کیے ہوئے ناقص تلفظ کے آگے ہیچ تھا۔ دانتوں نے کچھ دنوں تک اُس کو ستایا لیکن پیٹ سے اچھے قوی لے کر نکلا تھا۔ اس نے بسہولت اس مشکل گھاٹی سے بھی نکل آیا۔ پوری بتیسی تو نہ تھی مگر ٹوٹی پھوٹی جیسی تھی اُس کو اپنی جبلّی خوش طبعی سے اکثر ناز کے ساتھ اپنے پاس والوں کو دن میں سیکڑوں بار دکھاتا اور لوگوں کو یہ جھوٹے موتیوں کی لڑیاں دکھا دکھا کر اکثر نقد الفت حاصل کرتا۔

اس میں شک نہیں کہ نظیر کا لڑکپن نہایت خوشی میں گزرا ہے۔ اس کو اپنی ماں کے فراق کا صدمہ نہیں ہوا

اس کو دودھ کی طرف سے کچھ زیادہ تکلیف نہیں ہوئی - یہ اکثر بیماری جھیلا نہیں کیا - اس کے بزرگ تشدد اور مارپیٹ کے آدمی نہ تھے - اچھے ماں باپ اور بزرگوں کے زیر سایہ اس نے پرورش پائی اور ایک شگفتہ اور بے داغ دل لے کر دارالتربیت سے باہر آیا - وہ لڑکپن کو جہاں یاد کرتا ہے اُس کی تعریف میں بے اختیار ہو جاتا ہے جیسے آدم کو جنت کی یاد آئی ہو - عشرت ایام طفلی کے بیان میں یہ بند قابل ذکر ہیں -

کیا وقت تھا وہ ہم تھے جب دودھ کے چھٹورے — ہر آن آنچلوں کے معمور تھے کٹورے
پاؤں میں کالے ٹیکے، ہاتھوں میں نیلے ڈورے — یا چاندسی ہو صورت یا سانورے و گورے
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

گل کی طرح سے ہر دم سینے پہ پھولتے تھے — پی پی کے دودھ ماں کا خوش ہو کے پھولتے تھے
ماں باپ ان کی خدمت سر پر قبولتے تھے — ہاتھوں میں کھیلتے تھے، جھولوں میں جھولتے تھے
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

نے دوستی کسی سے نے دل میں ان کے کینا — جانیں نہ بے قرینہ نے سمجھیں کچھ قرینا
نے گرمیوں سے واقف نے جانتے پسینا — چھاتی سے ماں کی لپٹے خوش اُن کو دودھ پینا
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

جو دیکھے ان کی صورت لے پیار سے کھلائے — ہاتھوں اوپر اُچھالے، اور چھیڑ کر ہنسائے
چومے کبھی دہن کو، چھاتی کبھی لگائے — کوئی چسنی مُنھ میں دیوے، کوئی جھنجھنا بجائے
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

چھوٹا سا کوئی اُن کا کرتا نکالتا ہے — یا چھوٹی چھوٹی ٹوپی سر پر سنبھالتا ہے

ماں دودھ ہی پلاتی، اور باپ پالتا ہی
نانا گلے لگاوے، دادا اُچھالتا ہی

کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

کیا عمر ہی عزیزا اور کیا یہ وقت ہیگا
جب گھٹنیوں پہ آئے پھر اور کچھ تماشا
پاؤں چلے تو واں سے پھر اور پیار ٹھہرا
سب زندگی کا حظ ہی ان کو نظیرؔ اہا ہا!

کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

دوسری جگہ طفلی کی تعریف میں پھر یہ بند بھی قابل ملاحظہ ہیں:-

کیا دن تھے یار وہ بھی تھے جب کہ بھولے بھالے
نکلے تھی دائی لے کر، پھرتی کبھی دوالے
چوٹی کوئی رکھالے، بدھی کوئی پنھالے
ہنسلی گلے میں ڈالے، منت کوئی بڑھالے

موٹے ہوں یا کہ دبلے، گورے ہوں یا کہ کالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

دل میں کسی کے ہرگز نے شرم، نے حیا ہی
آگا بھی کھل رہا ہی، پیچھا بھی کھل رہا ہی
پہنے پھرے تو کیا ہی، ننگے پھرے تو کیا ہی
یاں یوں بھی واہ وا ہی اور وُوں بھی واہ وا ہی

کچھ کھالے اس طرح سے، کچھ اُس طرح سے کھالے الخ

مر جاوے کوئی تو بھی کچھ ان کو غم نہ کرنا
نے جانے کچھ بگڑنا، نے جانے کچھ سنورنا
ان کی بلا سے گھر میں ہو قند یا شکرنا
جس بات پہ یہ مچلے پھر وہ ہی کر گزرنا

ماں اوڑھنی کو، بابا پگڑی کو بیچ ڈالے الخ

جو کوئی چیز دیوے نت ہاتھ اوٹتے ہیں
گُڑ، بیر، مولی، گاجر لے منہ میں گھوٹتے ہیں

بابا کی مونچھ، ماں کی چوٹی کھسوٹتے ہیں — گردوں میں لوٹ رہتے ہیں، خاکوں میں لوٹتے ہیں

کچھ بن گیا سو پی لے کچھ بن گیا تو کھالے۔ الخ

جو اُن کو دیجو کھالیں پھیکا ہو یا سلونا — ہیں بادشہ سے بہتر جب مل گیا کھلونا
جس جا پہ نیند آئی پھر واں ہی اُن کو سونا — پروا نہ کچھ پلنگ کی نے چاہیے بچھونا

بھونپو کوئی بجالے پھرکی کوئی پھرالے۔ الخ

یہ بالے پن کا یارو عالم عجب بنا ہے — یہ عمر وہ ہے اس میں جو ہے سو بادشا ہے
اور سچ اگرچہ پوچھو تو بادشا بھی کیا ہے — اب تو نظیرؔ میری سب کو یہی دعا ہے

جیتے رہیں سبھوں کے آس اور مراد والے۔ الخ

قیس کے پردے میں نظیر اپنی نازپروردگی کا حال یوں بیان کرتا ہے:-

پیدا ہوا تھا قیس جب اپنے پدر کے گھر — ماں باپ کو ہوئی تھی خوشی سب سے بیشتر
کنبے کے لوگ بیٹھے تھے باہم سب آن کر — اک دھوم مچ رہی تھی خوشی کی اِدھر اُدھر
چومے تھا باپ قیس کے ہر لحظہ چشم و سر — رکھتے تھے ہاتھوں چھاؤں اُسے گرچہ بے خطر
ماں بھی لیے پھرے تھی اسے اپنے دوش پر — فرزند کی خوشی میں لُٹاتی تھی سیم و زر

لیکن وہ ماں کی گود میں آکر نہ سوتا تھا
ہر وقت شور کرتا تھا، ہر لحظہ روتا تھا

اور تھپک تھپک کے سلاتی تھی کر کے پیار — پھرتا تھا باپ فال دکھاتا بہ چشم زار
تعویذ ڈالتا تھا گلے بیچ بے شمار — لیکن اُسے قرار نہ آتا تھا زینہار

رہتا تھا اک فقیر کوئی واں بزرگوار	جس دم وہ حال اُس پہ کیا جا کے آشکار
سُنتے ہی اُس نے آہ کی اور ہو کے اشکبار	مجنوں کے باپ سے یہ کہا اس گھڑی پکار

"دُکھ پانے والے لڑکے جو دُنیا میں آتے ہیں
لچھن سب اُن کے پہلے ہی پہچانے جاتے ہیں"

لڑکا ترا یہ عاشقِ بِسیار ہووے گا" وغیرہ وغیرہ۔

شیر خوارگی کے عالم سے گزر کر جب نظیر دوڑنے اور چلنے پھرنے لگا اور کسی قدر ہوش سنبھالا تو وہ چسُنی اور جُھنجھنے وغیرہ تو رخصت ہوئے لیکن اور بہت سے دوسرے کھلونوں نے ان کی جگہ لی۔ دیوالی آئی تو اپنے ساتھ بیسیوں کھلونے دیوالی کے لائی

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تہوار	کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے اُدھار
کھلونے کھیلوں بتاسوں کا گرم ہے بازار	ہر اک دکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار

سبھوں کو فکر ہے اب جا بجا دوالی کا

مٹھائیوں کی دُکانیں لگا کے حلوائی	پکارتے ہیں کہ" لالہ دوالی ہے آئی"،
بتاسے لے کوئی، برفی کسی نے تُلوائی	کھلونے والوں کی ان سے زیادہ بن آئی

گویا انھوں کے واں راج آگیا دوالی کا

مٹھائی کے آدمی ہیں۔ جانور ہیں۔ مٹی کے بیل ہیں۔ گائیں ہیں۔ گھوڑے ہیں سیکشن جی اور رام و لچھن کی ہزاروں طرح کی مورتیں ہیں۔ گائیں ہیں تو ان کے بچے چھاتی سے لگے دودھ پی رہے ہیں اہیرن ناز و انداز سے سر پہ دہی کی مٹکی لیے مٹکتی چلی آرہی ہے۔

عید آئی تو عید کے کھلونوں نے دھوم مچائی۔

جو جو کہ ان کے حُسن کی رکھتے ہیں دل سے چاہ
جاتے ہیں اُن کے ساتھ لگے تا بہ عید گاہ
توپوں کے شور اور دوگانوں کی رسم و راہ
میانے، کھلونے، سیر، مزے، عیش، واہ واہ

ایسی نہ شبِ[۱] برات نہ بقرعید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اِس عید کی خوشی

ابرک کی پالکیاں ہیں۔ قندیلیں ہیں۔ انواع انواع طرح کے خوب صورت پنکھے ہیں۔ سُرخ سُرخ چھڑیاں ہیں۔ لکڑی کی مُطلا اور مذہب تلواریں ہیں۔ خوب صورت میانوں میں بند۔ چھوٹی چھوٹی مزے کی ڈھالیں ہیں۔ بزرگ عیدگاہ گئے ہیں۔ وہیں سے لیتے آئے ہیں۔ میاں نظیر ہر ایک کھلونے کو دیکھ رہے ہیں۔ ہر ایک پر کچھ نہ کچھ رائے دیتے جاتے ہیں۔ آبا یہ اچھا ہے۔ اہاہا کیا ہی چمکتی ہوئی قندیل ہے۔ بیٹا تلوار اور ڈھال لو اس سے تم سپاہی کہلاؤ گے۔ آبا میں سپاہی نہیں بنا چاہتا۔ وہ ظالم ہوتے ہیں۔

شبرات آئی تو باپ پر فرمایش ہو رہی ہے۔ آبا مجھے انار اور مہتابی پھول منگا دو۔ ہوائی بھی خوب ہوتی ہے۔ مہتابی کی بھی اچھی سیر ہے۔ جس وقت چھوٹتی ہے کالا آدمی بھی گورا دکھائی دینے لگتا ہے۔ گھنچکر لانا تو ذرا خوب دم کا ہو کہ گھنٹے بھر تک تو چکر کھائے۔ لٹو۔ تومڑی۔ ٹونٹے۔ زرکی۔ چھچھوندر۔ پٹاخے۔ گلکاری۔ کُلھیا۔ قلم نرٹی وغیرہ کا بھی فہرست میں مذکور ہے۔ باپ ہونہار بیٹے کی فرمائش سر آنکھوں سے بجا لاتے ہیں اور بیٹے کے بہلنے سے آپ بھی آتش بازی کی سیر سے لُطف اُٹھاتے ہیں۔ نظیر اپنی مآل اندیشی سے معمولی بے خطر آتش بازیوں کے سوا کسی کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ خطرناک آتش بازیوں کے جلانے میں محلّے کے شریر لڑکے اور گھر کے نوکر چاکر

[۱] انشا۔ شبِ برات جو آئی تو دیکھو انشا۔
کہ مچ رہی ہے پٹاخوں کی کیا پٹاخ پٹاخ +

مصروف ہیں۔ انار اور ہت پھول چھوٹ رہے ہیں معلوم ہوتا ہی گھر میں پھلواری کھلی ہوئی ہی۔ کبھی گھر سے لڑکوں کے غول باندھ کر لڑنے جاتا ہی اور وہاں یہ سیر دیکھتا ہی۔

آکر کسی کے سر پہ چھچھوندر لگی کڑی
ہو گئی گلے کا ہار پٹاخے کی ہر لڑی
اوپر سے اور ہوائی کی آکر پڑی چھڑی
پانوں سے لپٹی شور مچا کر قلم نڑی
کرتی ہی پھر تو ایسی ستم گاری شب برات

چہرہ کسی کا جل گیا، آنکھیں جھلس گئیں
ٹانگیں کسی کی تو رانیں جھلس گئیں
چھاتی کسی کی جل گئی، بانہیں جھلس گئیں
مونچھیں کسی کی پھک گئیں، پلکیں جھلس گئیں
رکھتی کسی کی ڈاڑھی پہ چنگاری شب برات

دہلی شہر بڑا ہی۔ دن بھر میں سیکڑوں تماشے والے آتے ہیں۔ ابھی ریچھ والا آیا۔ ریچھ نچا کر اور ریچھ کے اور اپنے کرتب اور کشتی کی سیر دکھا کر چلا گیا تو مچھندر بندر اور بکرا لے کر پہنچا۔ کچھ دیر ان کی سیر کی

کھڑکی کا حسن دیکھا تو پھر نچا کے بندر
بکرا بھی لا اٹھایا اس کام کا سمندر
جب ڈگڈگی بجائی کوچے گلی کے اندر
لڑکے ہزاروں بولے: "آؤ میاں قلندر"
سو مکر و فن بنانا، سو رنگ روپ بھرنا
عاشق کو ہر طرح سے خوباں کی دید کرنا

پھر ایک استاد گلہری کا بچہ لے کر پہنچے۔

سفیدی میں وہ کالی دھاریاں ایسی ہی ہیں بن
کناری دار پٹا جس میں گھنگرو کرتے چھن چھن
کہ جیسے گال پر لڑکوں کے چھوٹے زلف کی ناگن
گلے میں ہنسلی پانوؤں میں کڑے اور ناک میں لٹکن

رہا ہی سر بسر گہنے میں بھر بچہ گلہری کا

اُستاد کی تصویر بھی قابل ملاحظہ ہی :-

وہ دیکھیے تو بُری صورت بُرا حال، اور پھٹے کپڑے ۔۔۔ بڑھے داڑھی کے بال، اور زرد منہ آنکھوں میں آنسو ہے

بندھی میلی سی پگڑی سر پہ، اور ٹکڑے انگرکھے کے ۔۔۔ وہ کپڑے گو پھٹے تھے، پر ہم اپنے فن میں تھے پورے

لگا رکھتے تھے ایسے وقت پر بچپا گلہری کا

مُلاحظہ کیجیے کہ کس شان سے اُستاد گلہری کا بچہ نکالتے ہیں :-

نظر سے اس کی ہر نے جب تھے وہاں اس بات کو تاڑا ۔۔۔ کمر کو دیکھ ڈھونڈی جیب پگڑی کو ٹٹول اس جا

وہیں ہم نے نکالا ڈھونڈ کر بچپا گلہری کا

ریچھ والے قلندر تشریف لائے ہیں - اور یوں فرما رہے ہیں - قلندر کی تصویر کیا ہی ہو بہو ہی -

تھا ہاتھ میں اک اپنے سوا من کا جو سونٹا ۔۔۔ لوہے کے کڑے جس پہ کھڑکتے تھے سراپا

کاندھے پہ چڑھا جھولنا اور ہاتھ میں پیالا ۔۔۔ بازار میں لے آئے دکھانے کو تماشا

آگے تو ہم اور پیچھے وہ تھا ریچھ کا بچا

ریچھ کی تصویر :-

تھا ریچھ کے بچے پہ وہ گہنا جو سراسر ۔۔۔ ہاتھوں میں کڑے سونے کے بجتے تھے چھمک کر

کانوں میں دُر، اور گھنگرو تھے پاؤں کے اندر ۔۔۔ وہ ڈور بھی ریشم کی بنائی تھی جو پُر زر

جس ڈور سے یارو تھا بندھا ریچھ کا بچا

جھمکے وہ جھمکتے تھے پڑے جس پہ کرن پھول ۔۔۔ مُقیش کی لڑیوں کی پڑی پیٹھ اوپر جھول

اور اُن کے سوا کتنے ٹھلائے تھے جو گُل پھول
یوں لوگ گرے پڑتے تھے سر پانو کی سُدھ بھول
گویا وہ پری تھا کہ نہ تھا ریچھ کا بچا

لیجیے اب قلندر اپنے ریچھ کے بچے کو نچاتا ہے:-

مدت میں اب اس بچے کو ہم نے ہے سدھایا
لڑنے کے سوا ناچ بھی ہے اس کو سکھایا
یہ کہہ کے جو ڈھپلی کے تئیں گت پہ بجایا
اس ڈھب سے اُسے چوک کے جمگھٹ میں نچایا
جو سب کی نگاہوں میں کُھبا ریچھ کا بچا

پھر ناچ کے وہ راگ بھی گایا تو وہاں واہ
پھر کُھر وانا چا تو ہر اک بولی زباں "واہ!"
ہر چار طرف سینتی کہیں پیر و جواں "واہ!"
سب ہنس کے یہ کہتے تھے: "میاں واہ! میاں واہ!"
کیا تم نے دیا خوب نچا ریچھ کا بچا!

آئیے اب ریچھ کی کُشتی بھی ملاحظہ کیجیے:-

جب ہم نے اُٹھا ہاتھ کڑوں کو جو ہلایا
خم ٹھونک پہلواں کی طرح سامنے آیا
لپٹا تو یہ کُشتی کا ہنر آن دکھایا
جو چھوٹے بڑے جتنے تھے اُن سب کو رجھایا
ہم بھی نہ تھکے اور نہ تھکا ریچھ کا بچا

جب کُشتی کی ٹھہری تو وہیں سر کو جو جھاڑا
للکارتے ہی اُس نے ہمیں آن لتاڑا
گہ ہم نے پچھاڑا اُسے گہ اُس نے پچھاڑا
اک ڈیڑھ پہر ہو گیا کُشتی کا اکھاڑا
پر ہم بھی نہ ہارے، نہ ہٹا ریچھ کا بچا

جو حُسن شیر دیکھا تو ریچھ کو نکالا
کُشتی سے کھڑ کھڑایا اور آپ کو اُچھالا

اوربن کے ریچھ والے سونٹا کڑا لے سنبھالا | اس ریچھ سے بھی کتنے گل رو کو دیکھ ڈالا

سو مکر و فن بنانا سو رنگ روپ بھرنا
عاشق کو ہر طرح سے خوباں کی دید کرنا

کہیں سے سر پر ایک بھاری ڈلیا لیے ہوئے سپیرا ابھی پہنچا۔ اژدہے کا بچہ نکال کر لوگوں کو دکھا رہا ہے۔ اور طرح طرح کے سانپ اور بچھوؤں سے بچوں کو بہلا رہا ہے۔

دیکھا جو حسن کوئی بلدار لہر کھایا | تو بن گئے سپیرے اور سانپ کو چلایا
پونگی بجا کے ہر دم سانپوں کا پھن ہلایا | اس سانپ کے بھی فن سے اپنا بھی من منایا

سو مکر و فن الخ

یہ حضرت تشریف لے گئے تو کسی طرف سے بئے والا پہنچا۔ بئے کا رنگ روپ اُس کی تیزی۔ اُس کی چلت پھرت سب نظیر کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ پیٹی سے اُس کی جو ڈورا بندھا ہوا ہے اُس پر بھی نظیر کی نظر ہے۔ بئے والا بیٹھ جاتا ہے اور تماشا کرنے لگتا ہے۔ کوڑی سامنے پھینک دی اور بئے کو اشارہ کیا۔ بجلی کی طرح چمکا اور جھٹ کوڑی اُٹھا لایا۔ کسی کے ہاتھ میں مہندی لگی ہوئی ہے چھڑا کر لے آیا۔ گرہ میں انگوٹھی چھلا باندھ دیا گیا اور اپنی چونچ اور پنجوں سے کھول کر لے آیا۔ پوستوں کا ڈول بنا کر دیا۔ کنوئیں سے پانی کھینچ کر لے آیا۔ اگر پاس میں کوئی عورت کھڑی ہے اُس کی پیشانی سے بندی ٹیکی اکھاڑ لایا۔ یہ سب باتیں نظیر کے دل پر گہرا اثر کرتی ہیں اور وہ نقش رفتہ رفتہ ایسا پکا ہو جاتا ہے کہ پھر کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتا۔

اب ہاتھ پر مرے جو نمودار ہے بیا | زردی میں اپنے رنگ کی زردار ہے بیا
جس دن سے میرے ہاتھ پہ وہ آرہی لگا | کوڑی کبھی اُٹھا، کبھی مہندی اُتار لا

کیا کیا پری رُخوں کی بہاریں ہیں دیکھا / بیٹی سے اُس کی یارو یہ ڈورا نہیں بندھا

لڑکوں کی اُلفتوں میں گرفتار ہو بیا

اُڑتے کو دیکھ جب سے لیا ہی یہ ہم نے مول / پھرتے ہیں ساتھ تب سے کئی دلبروں کے غول
چھلا انگوٹھی لاتا ہی ہر دم گرہ سے کھول / پانی کنوئیں سے کھینچے ہو کر پوستوں کے ڈول

ایسا ہنر میں اپنے نمودار ہو بیا

کرتا ہی آکے بندی و ٹیکی پہ جب یہ چوٹ / بالوں کی لٹ دکھاؤ تو لاوے وہیں کھسوٹ

کبھی یہی شخص جس کے پاس اب بیا ہی گلہری کا بچا۔ نیٹی باز طوطا۔ سدھا ہوا بگلا بھی لے کر آیا تھا اور جانوروں کی جو اُس کی تعلیم نے اثر کیا تھا اُس کا نظیر کے دل پر عمدہ اثر ڈالا تھا۔

آگے ہمارے پاس تھا بچا گلہری کا / طوطا، نیٹی، اور تھا بگلا سدھا ہوا
اُن کو تو ہائے چور کوئی لے گیا چرا / اب اس کا ہی ہمارے تئیں یارو آسرا

اس بےکسی میں اب تو مددگار ہو بیا

خوبی کا لہر کھاتا دیکھا جو حُسن لہری / پالے بٹیر، طوطے، بگلے، بے، گلہری
کی بات وہی جو کچھ اُس کی پسند ٹھہری / اُس لہر کی ہی دیکھی کیا کیا بہار گہری

سو مکر و فن ۔ الخ

دیکھا جو حُسن یارو جوں لعل یا انگارا / تو لعل چٹی کا ہی پھر پالنا بچارا
کل یا کہ جال روکا اور لعل کو اُتارا / اُس لعل کے ہی ڈھب میں اُس پر بھی جال مارا

۱؎ کرنے کو دیکھ لینے بنظر دید بازی۔

سو کمر و فن الخ

جانور والے چلے جاتے ہیں تو کسی طرف سے ایک آدھ رنگ بھریے بھی آن کر اپنے بازار کا رنگ جماتے ہیں۔ گڑیوں کے چھوٹے چھوٹے زیور چھلّے انگوٹھی۔ بازوبند۔ کڑے۔ نونگے۔ نوگرھیاں۔ وغیرہ بنا بنا کر دے رہے ہیں۔ میاں نظیر اپنی ماما کے ساتھ ہیں کچھ تو اپنے شوق اور کچھ گھر کی لڑکیوں کی فرمایش سے زیور بنوا بنوا کرلے جا رہے ہیں۔ کیا دن ہیں کہ معمولی تین کوڑی کے زیور ہزاروں اشرفیوں کے گہنے سے زیادہ خوش کر رہے ہیں۔ خیالات میں موزونی تو جبلّی ہی ہر ایک زیور کی نسبت کچھ نہ کچھ تشبیہات بھی ہم پہنچاتے جا رہے ہیں :-

پایا جو رنگ بھولا تو بنکے رنگ بھریے	چھلّے انگوٹھی ڈھالے سانچے کے کرکے بھریے
بولا کوئی جو اس میں کچھ تو خدا سے ڈریے	تو اس سے ہنس کے کہنا کچھ بات یاں نہ کریے

سو کمر و فن الخ

اکثر ایسا بھی ہوتا ہی کہ میاں نظیر بیٹھے ہیں۔ گھر کے کوئی خوش طبع رکن اُن کے پاس آن بیٹھے۔ اور اُن کو بعض کھیل کی باتوں اور کھیل کی چیزوں سے بہلانے لگے۔ شام کا وقت ہی۔ چراغ روشن ہو گیا ہی۔ چاندنی کھلی ہوئی ہی۔ تخت صحن میں بچھے ہوے ہین۔ ایک بزرگ لیٹے ہوئے ہیں۔ میاں نظیر اُن کی گود میں بیٹھے ہین۔ اُن پر تقاضے کر رہے ہیں۔ مرزا صاحب کوئی پہیلی ارشاد کیجیے۔ پہیلی سُنی تو اتے پتے پوچھ رہے ہیں۔ عقل لڑا رہے ہیں۔ کوئی دوسرے صاحب چاہتے ہین کہ حل کریں تو یہ اُن کو روکتے ہین کہ آپ نہ بتائیے۔ میں سوچ کر کہتا ہوں۔ جب کسی پہیلی کو بوجھ لیتے ہیں تو اُچھل پڑتے ہیں اور مارے خوشی کے جامے میں پھولے نہیں سماتے۔ کبھی گُرھیاں سُن رہے ہیں۔ کہنے والے نے ابھی ناکھی کہا بھی نہیں کہ اُنھوں نے اخیر لفظ تڑ سے

کہہ دیا۔ کبت اور کھنڈ اور خدا جانے کیا کیا چیزیں لوگ اُن کو سناتے ہیں اور یہ سب ایک خاص دلچسپی کے ساتھ لطفِ تازہ اٹھاتے ہیں۔

رات اس شوخ سے میں نے یہ پہیلی میں کہا:	"بھیگی بکری کسے کہتے ہیں بتاؤ تو بھلا؟"
اس پہیلی کے تئیں سن کے بڑے سوچ میں آ	جب نہ سمجھا تو کہا ہار کے "اب تو ہی بتا"

سن کے جب میں نے کہا: "ای مرے دل بر! تربوز"

دیکھا جو حسن قابل تو ریختہ بنائے	کچھ مکڑیاں بنائیں اور کچھ گیت بنائے
سکھیوں کی بحث ڈالی اور کھنڈ بھی چلائے	جب جھولنے پہ آئے پھر تو مزے اڑائے

سو مکر و فن بنانا۔ الخ

مرزا صاحب کو لڑکوں کے بہلانے کا ڈھنگ اچھا ہے۔ کبھی یہی حضرت دوسرے وقت بیٹھے ہیں۔ دو چار مکڑیوں کو لے کر ڈبیوں میں بند کیا۔ پھر ایک مکھی کو اس میں ڈال اُن مکڑیوں اور مکھی کی لڑائی کا تماشا دیکھا۔ کبھی چیونٹیوں کو اکٹھا کر کے اُن کی سیر دیکھی۔ کبھی تتلیوں کو گرفتار کر کے اُن کو نچایا۔ لکڑی کے پھول کتر رہے ہیں۔ سنگترے کو تراش کر اُس کی قندیل بنا رہے ہیں۔ مولی کا ہنس بگلا طیار ہو رہا ہے۔ گاجر کا مور باشا بن رہا ہے۔

جو حسن بالا دیکھا تو مکڑیاں بنائیں	ڈبیوں میں ڈال مکھی اور مکڑیاں لڑائیں
کچھ چیونٹیاں منگائیں کچھ تتلیاں نچائیں	ان تتلیوں کی خاطر کیا پتلیاں بنائیں

سو مکر و فن ۔ الخ

ہر اک پلنگ اُتارا شیشے میں، جڑ کے ماشا	لکڑی کے پھول کترے، اور سنگترہ تراشا
مولی کا ہنس بگلا، گاجر کا مور باشا	دیکھا ہر اک بہانے اُس حسن کا تماشا

سو مکر و فن ۔ الخ

نظیر کے مشاغل لہو و لعب

نظیر جس مزاج کا آدمی تھا، اور اُس کے کلام سے جیسا مترشح ہوتا ہے یقیناً اس نے بہت بڑا حصہ اپنی اوقات کا لہو و لعب میں صرف کیا ہے۔ وہ ایک متانت کی ادا سے چُپ چاپ بیٹھا نہیں رہ سکتا لوگ جیسی کھیل رہے ہیں تو آپ بھی شریک ہیں۔ جُوا ہو رہا ہے تو اُس میں بھی داؤ رکھنے کو حاضر ہیں۔ شطرنج میں بند نہیں۔ گنجفے میں عاری نہیں۔ اگر ایک دفعہ مات کھائی تو دوسری دفعہ کچھ ایسے بند و بست سے چلے کہ اگر مات نہیں کی تو بازی بُرد ضرور ہوئی۔ چوسر کے پاسے پھینک رہے ہیں۔ داؤ بول رہے ہیں۔ بازی بگڑی ہوئی ہے۔ گوٹ پر گوٹ کٹ رہی ہے پاسا یاری نہیں دیتا۔ مگر چال کچھ ایسی چل رہے ہیں کہ حریف کے چھکے چھوٹے ہوئے ہیں۔ ہارتے ہیں تو ایک دو پلے سے۔ جتنے مشغلے سوسائٹی میں جاری ہیں، اور اُن کی بنیاد کچھ آپس کی معاشرت پر معلوم ہوتی ہے، نظیر ہر میں شریک ہیں۔ کبھی آپ کو گیڑیاں بھی کھیلتے دیکھا گیا ہے۔ کبھی آپ جمنا میں کود رہے ہیں، گھنٹوں پڑے تیر رہے ہیں۔ کبوتر اُڑانے سے انتہا سے زیادہ ذوق ہے۔ کنکوے کثرت سے لڑاتے ہیں۔ جبھی تو حضرت کی ہم دردی اس قدر وسیع ہے کہ بُرے سے بُرے اخلاق، اور پاجی سے پاجی خیالات، اور ناپاک سے ناپاک مشغلے کے آدمی کو بھی یہ نظرِ عداوت سے نہیں دیکھتے۔ ہر کے ساتھ ایک طرح کی ہم دردی اور اُلفت ہی ہے۔

نظیر چوسر اِس طرح کھیلتے ہیں:۔

عجب طرح کی وہ رنگیں چوپڑ غرض بچھائی ہے اب خدا نے	کوئی ہے چھکا کسی کا جگ ہے، پھریں ہیں نرد دیں بھی خانے خانے
جو پاسا پھینکے بنا بنا کر وہ داؤں کتنے ہی دل میں ٹھانے	جو چاہتا ہو اٹھارہ آویں تو اُس کو پڑتے ہیں تین کانے

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر، خدا کی باتیں خدا ہی جانے

پھر شطرنج کے مہرے یوں بچھاتے ہیں:-

عجب یہ شطرنج کا سا نقشہ بچھا ہی دن اور رات اس جا
ہزاروں منصوبے باندھے دل میں، بتا وچالوں کی گھات اس جا
جو بات چاہے کرے کسی کو، نہ آوے بُرد اس کو مات اس جا
نہیں ہی اک جا پہ چوک قائم، سبھوں کی بازی ہی مات اس جا

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر، خدا کی باتیں خدا ہی جانے

پھر گنجفے کے ورق یوں پھیرتے ہیں:-

عجب طرح کے ورق بنے ہیں کوئی مکدر کوئی صفا ہی
کوئی امیر اور کوئی وزیر، اور کوئی فقیری میں دل شاہی
کسی کے سر پہ ہی تاجِ شاہی، کسی پہ شمشیر پُر جفا ہی
سبھوں کو اس جا خیال آیا، یہ حق کی قدرت کا گنجفا ہی

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر، خدا کی باتیں خدا ہی جانے

ایک دن ایک دل بر کی خدمت میں بیٹھا تھا۔ ایک دوسرا محبوب آیا اور اُس نے کہا "کوئی شغل کرنا چاہئے" اُس نے کہا "گنجفہ موجود ہی"۔ مجھ سے پوچھا "تجھ کو آتا ہی؟" میں نے کہا "یہاں تو نہیں آتا"۔ کہا "کیوں؟" میں نے کہا: "ے سرتاجِ من آفتاب رویاں ✦ من از دل وجاں غلام ایشاں" کہا "حکم سے بھی نہیں؟" میں نے کہا "درخوش دلی سُرخ روئی وبراتِ سعادت درچنگ بخجلت صد خوش قماش وشمشیرِ عتاب بے درنگ۔ پس انکارِ سفید وسیاہ بہ از اقرار"۔ اسی گفتگو میں ایک شوخ اور آیا۔ تینوں کھیلنے لگے اور میں اپنا حسن وناز کا

کنکوہ بازی

مشاہدہ کرتا رہا۔

میاں نظیر بالخلقہ سوسائٹی کے کیڑے ہیں۔ جن جن چیزوں میں وہ یہ لطف دیکھتے ہیں کہ اُن سے لوگ مجتمع ہوتے ہیں یہی اجتماع کی خوبی اُن کے شوق کے لیے محرک کافی ہوتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جہاں کنکوہ بڑھا، چھوٹے بڑے سب آن گھیرتے ہیں۔ دو چار سڑک پر کھڑے آسمان سے نظر لڑائے ہیں، دس میں صحن میں آڈٹے ہیں کوئی ڈور لوٹنے کی فکر میں ہے۔ کسی کو کنکوے کی گھات ہے۔ لڑکے ہجوم کیے ہوئے ہیں۔ مفت کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ کوئی آپ سے شیشہ پیس رہا ہے۔ کوئی شیشے کے ٹکڑے سمیٹ رہا ہے۔ کوئی لیپ طیار کر رہا ہے۔ کوئی مانجھا چڑھا رہا ہے۔ کوئی لپیٹ رہا ہے۔ کانپیں چھل رہی ہیں۔ کنکوے گھٹ گئے ہیں تو ایک دوڑا ہوا بازار سے لینے جا رہا ہے۔ گھر میں خاصہ میلا لگا ہوا ہے۔ چہل پہل اور آبادی معلوم ہوتی ہے۔

کنکوے پتنگ کی فصل آگئی ہے۔ اکا دکا اُڑنے لگے ہیں۔ بازاروں میں جا بجا دکانوں پر ان کی بہار ہے۔ اب میاں نظیر سے کہاں ضبط ہو سکتا ہے۔ نوکروں کو بازار دوڑایا ہے۔ ڈور کا بند و بست ہو رہا ہے۔ کنکوے آ رہے ہیں۔ بازار کے کنکووں سے عاجز آ کر کبھی خود اپنے ہاتھ سے کانپ چھیل رہے ہیں۔ انگلی پر اُس کا وزن دیکھ رہے ہیں۔ اپنے ہاتھ کا کنکوہ بڑھا کر آس پاس والوں سے اُس کی عمدگی کی داد لے رہے ہیں دیکھنا مرزا کیا سدھا کنکوہ ہے جہاں سے چاہو موڑ لو۔ گھرنی بھی جتنی چاہو کھلا لو۔ شاہ جی تم ذرا اس کنکوے کو ہاتھ میں لے کر دیکھو۔ ایسا شائستہ ہے کہ ایک بچہ بھی ہاتھ میں لیے رہ سکتا ہے۔ لانا وہ بڑھا آتا ہے۔ لاؤ اُسے کاٹ دوں۔ اگر دوسرے کے ہاتھ میں کنکوہ ہے اور کوئی اُس کی طرف کنکوہ لیے آتا ہے تو اُس کو ہدایت بھی فرماتے ہیں:-

لاتا ہے پھیر پھار کے تکل جو اپنی واں   کہتا ہے کوئی اُن سے "خبردار ہو میاں،"

ب پیچ پڑنے کو ہے نہ دبے اتنی ٹھمکیاں
گھبرا کے کٹنے اس کے نہ پھنسنے دو، میری جاں
اچھا نہیں ہے مفت کھپانا پتنگ کا"

پیچ پڑ جاتا ہے تو پیچ ڈھیل دینے اور رگڑا دینے کے قاعدے بتاتے ہیں:-

گر پیچ پڑ گئے تو یہ کہتے ہیں: "دیکھو
رہ رہ اسی طرح سے نہ اب دیجیے ڈھیل کو
پہلے تو یوں قدم کے تئیں او میاں رکھو
پھر ایک رگڑا دے کے ابھی اس کو کاٹ دو
ہیگا اسی میں نسخ کا پانا پتنگ کا"

پتنگ کے کٹنے پر لوٹنے کی سیریں یوں دکھاتے ہیں:-

کٹتا ہے جو پتنگ تو پھر لوٹنے اُسے
دو دو ہزار دوڑتے ہیں چھوٹے اور بڑے
کاغذ ذرا سا ملتا ہے، یا ٹکرے کانپ کے
جب اس طرح کی سیر بھلا آن کر کرے
پھر سوچیے تو کیا ہے ٹھکانا پتنگ کا

سنہ [illegible] کنکوے کا میاں نظیر کو چوں کہ شوق بہت تھا اکثر احباب کبھی پتنگ کا کاغذ، اور کبھی خود کنکوے بھیج دیتے تھے۔ ایک دوست نے کاغذ پتنگ کا بھیج دیا تھا، اُس کا شکریہ یوں ادا کرتے ہیں:- کاغذ مہرہ دو رویہ کشیدہ پتنگ کہ جلائے آئینہ رامنصوبہ تحیر افزاید، وبصافی رخسار پری بازی نماید بدست پیادہ تیز رفتار رسید۔ خاطر پُر ہوس ہوائے طفلی در سر قائم بگنج مراد پے بُرد، و ابتہاج بشمار اوراق رو باوقات لہوسنات آورد۔

اپنے شوق کی وجہ نظیر ضمناً یوں بیان کرتے ہیں:- (یعنی چوں کہ اس میں چھوٹے بڑے سب کی خوشی مضمر اس لیے پتنگ ایک اچھی چیز ہے اور اس کا شوق بھی ایک امر ضروری ہے کہ اس سے لوگوں سے ملنے جلنے کا

ایک خاصہ موقع ہاتھ آتا ہی)

اس آگرے میں یہ بھی تماشا ہی دل پذیر کیوں کر نہ دل پتنگ کی ہو ڈور میں اسیر	ہوتے ہیں دیکھ شاد جسے خُرد اور کبیر خوباں کے دیکھنے کے لیے کیا، میاں نظیر
ہی یہ بھی ایک طُرفہ بہانا پتنگ کا	

نظیر ذیل کی قسموں کا خاص ذکر فرماتے ہیں اور ہر ایک کی خاص شاعرانہ مدحت بیان کرتے ہیں۔ دو باز۔ مل پرا۔ گھایل۔ لنگوٹیا۔ چاند تارا۔ پہاڑیا۔ بگلا۔ دو پتا۔ دہیڑ۔ گلھریا۔ دودھایا۔ مانگ دار۔ خربوزیا۔ پینڈی پان۔ بمنا۔ دو کونیا۔ کلسرا۔ چپ۔ لکڑی۔ چوگھڑا۔ چچکا۔ تکل۔ مبھباؤ۔ کج کلاہ۔

کبوتر بازی:- میاں نظیر خود فرماتے ہیں کہ ؎ چھوڑ ان کو نظیر، اپنا دل اب کس سے لگاویں؟ اپنے، تو لڑکپن سے ہیں، دم ساز کبوتر + اس سے معلوم ہوتا ہی کہ ابتدائے طفولیت سے اِن کو کبوتر کا شوق تھا۔ اور لُطف یہ کہ تا عمر یہ شوق رہا۔ جب کہ اشتغال کا یہ حال ہو تو یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ کبوتر بازی کی اصطلاحات سے اُن کو واقفیت نہ تھی۔ وہ اِس فن کو اُستادوں کی طرح جانتے تھے۔ اکثر کبوتر بازی بد کر اُڑاتے اور بیسیوں کبوتر جیت کر لے آتے۔ کبوتر کے علاج معالجے میں بھی ان کو وقوف تھا۔ کبوتر کے نئے نئے رنگ پیدا کرنے کی عجب عجب تدبیریں ان کو معلوم تھیں۔ جہاں قابل لوگ ان سے شعر و شاعری میں اصلاح لیتے، جُہلا اور عوام اور نواب زادے امیر زادے اِن سے کبوتر بازی میں فیض حاصل کرتے، اور ان کی واقفیت اور مہارت دیکھ کر اُن کے ہوش اُڑ جاتے۔

کبوتر چھتری پہ بیٹھے ہوئے ہیں اور نظیر اُن کو دیکھ دیکھ کر خوش ہیں، اور یوں ارشاد کرتے ہیں:-

تاروں کے وہ انداز نہیں بام فلک پر — جو کرتے ہیں چھتری کے اُپر ناز کبوتر

پھر ہاتھ میں چھپی لیتے ہیں اور اس طرح فرماتے ہیں:-

گو کرکے، جدھر کے تئیں چھیپی کو ہلاویں — کچھ ہووے، غرض پھر وہ اُسی سمت کو جاویں
گٹی کو نہ پھڑکاویں تو پھرتہ پہ نہ آویں — چھوڑ ان کو، نظیر اپنا دل اب کس سے لگاویں؟
اپنے، تو لڑک پن سے ہیں دم ساز کبوتر

صرف آٹھ بندوں کی تو ایک نظم لکھی ہی، مگر اسی مختصر میں اتنے کبوتروں کے نام بھر دیے ہیں کہ خاصہ کبوتر خانہ معلوم ہوتا ہی- ان ناموں میں سے اکثر کی تحقیق ہوئی لیکن بعض ایسے ہیں کہ بڑے بڑے نامی کبوتر باز بھی اُس کی حقیقت نہ بتا سکے- اس سے ظاہر ہوتا ہی کہ نظیر کی کبوتر بازی کی معلومات کس قدر زائد تھی-

گولا- گرہ باز- بصرئی- کابلی- شیرازی- نساور- چو یاچندن- سبزہ- کمگی- شست رو- اکرے- طاؤسی- گل پوٹیا- نیلا- گلی- تھیتڑ- لقا- چیتیا- جوگیا- کھیرا- ٹپیت- چپ- نفتا- کھرا- زرچہ- گل آنکھ- لل آنکھ- اودا- زردہ- کابرہ- تیرہ- مسی- توسی- پلکا- سیابیا- گھاگرا- تمبولیا- پان لعل- اگرئی- سُرمئی- عنبری- خال- بھورا- گلسی- تانبڑا- بُنرا- ہسترے- کاسنی- لوٹن-

کم وبیش پچاس قسم کے کبوتر اس میں مذکور ہیں- اس پچاس میں اکرے- کھرا- ہسترا- ان تین قسموں کا حال معلوم نہ ہوا کہ کیا بلا ہیں-

کبوتر کی چال اور زمزمہ سنجی کی یوں تصویر کھینچتے ہیں:-

پھرتے ہیں ٹھمک چال سناتے ہیں خوشی سے	کیا کیا وہ غٹرغوں کی خوش آواز کبوتر۔

کبوتر کی پروازیں یوں دکھاتے ہیں:-

لڑتے ہیں ادھر اپنی کساوٹ کو دکھاتے	ہیں جو گیے بھی رنگ کئی جوگ کے لاتے
چھتے ہیں اُدھر سیمبری اپنی جتاتے	پریوں کے پرے دیکھ کے ہیں چرخ میں آتے

جب حلقہ زناں کرتے ہیں پرواز کبوتر

انسان میں ایک ہمدردی عام کا مادہ رکھا گیا ہے۔ یہی مادہ ہے جس پر دار و مدار تمدن عالم انسانی ہے۔ اس تمام اُلفت کے مادے کو بعض رباعیوں اور مثنوی میں میں نے عشق[1] سے تعبیر کیا ہے اور واقع میں عشق حقیقی اسی کا نام ہے۔ یہ الفت نہ فقط انسان کو اپنی نوع کے ساتھ ہوتی ہے بلکہ اس کا سلسلہ تمام اجزا کائنات تک پہنچتا ہے۔ جو مخلوق جس قدر اُس سے نوع میں قریب ہے اُسی قدر اُس سے زیادہ مالوف ہے گائے بیل گھوڑے وغیرہ سے جو اس کو ربط ہے گو اس میں کسی قدر اپنی منفعت بھی مقصود ہے لیکن ربط کا اصلی محرک وہی ہمدردی عام ہے۔ جہاں جہاں جسم نامی متحرک بالارادہ دیکھتا ہے اس کو اُس کے ساتھ ایک خصوصیت ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور بغیر اس کے کہ کوئی منفعت مقصود ہو اُس سے تعلق پیدا کرتا ہے اور اس کا دل تسکین پاتا ہے۔

ہرچند سوسائٹی میں ان جانوروں کے ساتھ صحبت رکھنے کا چنداں انسان محتاج نہیں لیکن اُس کا مدنی الطبع ہونا اُس کو تنہائی کے اوقات میں کبھی کبھی محض جانوروں کی صحبت سے وہی لذت بخشتا ہے جو کسی انسان کی صحبت سے حاصل ہو سکتی۔ لاٹیوڈ ایک قیدی کی نقل مشہور ہے کہ کس طرح چوہوں نے اُس کو قید تنہائی میں مدتوں خوش رکھا تھا۔ کس طرح وہ اُن کے قدوم کا منتظر رہتا تھا اور کس طرح اُس کو اُن کی شکر پہ آسینہ

[1] عشق سیکھو بنیت کے لیے حسن دل، خوبی نیت کے لیے

اُچھل کود اور معصومانہ کھیلوں اور حرکات سکنات سے لُطف حاصل ہوتا تھا- حقیقت یہ ہی کہ جب اپنی نوع کے ساتھ اُلفت اور ہمدردی کا اُس کو موقع نہیں ملتا تو وہ ہمدردی جو عامۂ حیوانات کے ساتھ اُس کو ہی موقع پا کر اُبھرتی ہی اور اپنے فعل میں مصروف ہوتی ہی- نوعی ہمدردی چوں کہ قوی ہی اس لیے اُس کے مقابل میں دبی رہتی ہی لیکن جب وہ باقی نہیں رہتی تو پھر اپنا زور دکھاتی ہی- کبھی جب ایسی تنہائی ہوتی ہی کہ حیوانات بھی نہیں ہوتے تو فقط عام منظرِ عالم سے انسان کو وہی لُطف حاصل ہوتا ہی- دریا کا پاٹ- آسمان کی وُسعت- صحرا کی فضا بھی کبھی کبھی اُس کے قلب کے ساتھ وہی اثر رکھتی ہی-

ہمدردی کے علاوہ ایک خیال تفحص اور تجسسِ احوال کا جانوروں کے پالنے میں محرک ہی- انسان دیکھتا ہی کہ فلاں جانور چلنے پھرنے، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے سب میں ہمارے شریک ہیں- لیکن خدا نے ان کو زبان نہیں دی کہ ان سے دریافت کریں کہ دل میں کیا سوچا کرتے ہیں ؟- ان کے ایک دوسرے کے ساتھ خیالات کیسے ہیں ؟- ان میں احسان مندیوں کا وزن کیا ہی ؟- ان کو اوروں کے ساتھ سلوک کے کس قسم کے قاعدے سکھائے گئے ہیں ؟- ان میں سوسائٹی ہی یا نہیں ؟- اور اُس کے کیا قواعد ہیں ؟- ان میں شر و فساد انگیزی کا کس قدر مادّہ دیا گیا ہی اور آیا وہ ضرورت سے زیادہ ہی یا ٹھیک بقدرِ ضرورت ؟ از یں قبیل اَور بہت سے خیالات پیدا ہوتے ہیں، اور انسان کو اِسی تعلق سے اُن کے ساتھ ایک خاص تعلقِ خیالی پیدا ہو جاتا ہی- وہ غیر محسوس طور پر اُن کا شوق دل میں پیدا کرتا ہی اور اُن کو گھر میں لا کر چندے اُن کی عادات و اخلاق، اور حرکات و سکنات، اور طرزِ زندگی کی تفتیش کرتا ہی، اور جس قدر اُس کی معلومات بڑھتی جاتی ہی اُس کی تفتیش کی گُدگُدی کم ہوتی جاتی ہی یہاں تک کہ اخیر میں اطمینان پیدا ہو جاتا ہی-

تفحص کے ساتھ کسی قدر تازگی پسندی کو بھی اس میں دخل ہی- ہر چند سوسائٹی اُس کے لیے ایک بہت

دل کش چیزیں ہیں لیکن بعض اوقات وہ ایک ہی طرح کی مسلسل حالت کے یکسانی کے ساتھ گزرتے چلے جانے سے کسی قدر افسردہ اور ملول ہو جاتا ہی۔ گھر اگرچہ منقش اور مطلا، وسیع اور پُر فضا، نہایت پُر زر پردوں سے آراستہ، اور طلائی اور نقرئی ظروف اور لوازمِ خانہ داری اور اسبابِ زینتِ مکان سے پیراستہ ہو لیکن دن رات وہیں رہتے رہتے کچھ ایسی یکسانی پیدا ہو جاتی ہی کہ پھر گھر کاٹنے دوڑتا ہی، اور اُس وقت یہی اچھا معلوم ہوتا ہی کہ کسی صحرا میں کسی سایہ دار درخت کے تلے انسان بیٹھا ہو۔ دریا کا سیمابی تختہ لغزش لے رہا ہو۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوں چاندنی کھلی ہو۔ جانور چہک رہے ہوں۔ علیٰ ہذا پری تمثال خاتونوں، اور غلمان وش نوجوانوں کی صحبت سے بھی انسان اکتا جاتا ہی، اور ایسے وقت میں ایک غزالِ وحشی کی آنکھیں ہزار حوروں کی چشمِ فتان سے زیادہ دل فریب معلوم ہوتی ہیں۔ ایک بلبل کا چہکنا ہزار ہارمونیم اور پیانو سے بڑھ کر جادو تاثیر معلوم ہوتا ہی۔ کبوتروں کی غٹرغوں کسی پری وش کے ناز و نیاز سے زیادہ مزہ دیتی ہی۔ اور فاختہ کی کوکو حکما اور فلاسفہ کے چون و چرا سے زیادہ لذت بخشتی ہی۔

بڑے بڑے شہروں میں جو عام نزہت گاہیں اور چڑیا خانے اور عجائب خانے وغیرہ بنے ہوتے ہیں اسی حکمت سے ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کو چنداں تو ساتھ کی یکسانی ملول نہیں کرتی، لیکن جو لوگ دماغی کام زیادہ کرتے ہیں اُن کو بہت جلد اس کی یکسانی افسردہ کرنے لگتی ہی، اور تا وقتیکہ اُن کی تازگی پسندی نزہت گاہوں اور چڑیا خانوں اور دوسرے ایسے مقاموں میں اپنی غذا نہ پائے گردِ ملالت رفع ہو نہیں سکتی، اور اگر ہوگی تو دیر میں ہوگی۔

بہ اعتبار اسکے کہ نظیر میں وہ ہمدردیٔ عام کا مادہ بھی علی العموم لوگوں میں جس قدر ہوتا ہی اُس سے کہیں زیادہ تھا، اور اُس میں تفتیش و تلاش کی گدگدی بھی انتہا سے بڑھ کر تھی۔ دماغی کاموں میں اشتغال کے سبب

تازگی پسندی سے کام لینے کا وہ زیادہ محتاج بھی تھا، ان اسباب سے اُس کو ابتدائے عمر سے ہم جانوروں کے پالنے میں مصروف پاتے ہیں۔ پالنے کے جو بعض طیور ہیں اُن کو وہ "شوق کے طائر" اور "بازی و اشغال کے طائر" بتاتا ہے۔ شوق کے طائر سے غرض یہ ہے کہ وہ طیور جن کو انسان اُس عام ہمدردی کے تقاضے سے پالے جو ہر جان دار مخلوق کے ساتھ اُس کو ہے۔ اسی تقاضے سے پالنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ بازی و اشغال کے طیور سے مراد یہ کہ بعض اوقات انسان پر بے شغلی سے کسی قدر تکلیف ہوتی ہے، اور کوئی زیادہ اہم شغل اُس کو اُس وقت کرنا مناسب نہیں، تو اُس وقت کسی قدر اپنے آپ کو کھیل میں ڈال دیتا ہے، اور کھیل سے بعض اشغال میں مشغول ہو کر اپنے جی کو بہلا لیتا ہے۔ اس قسم کے طیور میں وہ ان چڑیوں کا ذکر کرتا ہے:-

بلبل۔ قمری۔ چہے۔ پدڑی۔ پدڑے۔ چنڈول۔ اگن۔ لال۔ بئے۔ ابلقہ۔ طوطے۔ طوطی۔ مینا۔ پلپی۔ تیتر۔ شکرے۔ کبوتر۔

کیا بلبل و قمری و چہے پدڑی و پدڑے	چنڈول۔ اگن۔ لال۔ بئے۔ ابلقے۔ طوطے
کیا طوطی و مینا و پپی۔ تیتر و شکرے	طائر ہیں، غرض، بازی و اشغال کے جتنے

کی غور تو ہیں سب میں سرافراز کبوتر

جنگِ بلبلان:- بلبلوں کے لڑانے سے بھی نظیر کو بہت شوق تھا۔ بلبل کی پٹی باندھ رہے ہیں۔ پٹی ہاتھوں میں ہے۔ اڈے[1] پر اُس کو بٹھائے لیے پھر رہے ہیں۔ لڑائی کی پالی ہوتی ہے تو اُس میں جاتے ہیں۔ عجب عجب فن معلوم ہیں۔ بلبلیں لڑ رہی ہیں۔ ایک کنکری پھینک کر ماری۔ بلبلوں کی گٹھری بندھ گئی۔ لوگ سمجھے جادو کیا۔ سب بولے: "واہ حضرت، اچھی یہ پڑھ کے پھونکی!"

[1] اڈے کو چکس بھی کہتے ہیں۔

کل بلبلیں جو نو دس قابو میں اپنے آئیں
یہ شور سن کے خلقت دوڑ آئی دائیں بائیں
اُس میں سے دو بگڑ کے کشتی میں دھر بھڑائیں
کوئی بولا "واہ حضرت!" کوئی بولا "واہ بائیں"!

سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اِس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں لڑائیں

دس میں تو دو نو کٹ کٹ لڑتی تھیں کرکے کڑا
خلقت بھی آکے ٹوٹی چھوڑا اپنا اپنا اڈّا
جب تیسری کو چھوڑا پھر تو ہوا اکھڑّا
کڑکی کسی کی پسلی، ٹوٹا کسی کا ہڈّا

سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اِس ڈھب سے ہم نے یارو، کل بلبلیں لڑائیں

تھی تین کی یہ کشتی، چوتھی کو اس میں چھوڑا
پھر تو یہ پھڑکا آکر ان کشتیوں کا کوڑا
اُس نے تو خم بجا کر تینوں کو دھر جھنجھوڑا
چھوٹا کسی کا ہاتھی، بھاگا کسی کا گھوڑا

سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اِس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں لڑائیں

اک کنکری جو ماری پڑھ ہم نے پھرفسوں کی
سن سن کے چیخیں اُن کی لڑنے میں غٹرغوں کی
کشتی میں گٹھری بندھ گئی اُن چاروں بلبلوں کی
سب بولے: "واہ حضرت! اچھی یہ پڑھ کے پھونکی!"

سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اِس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں لڑائیں

ایک پودنے کی لڑائی کا قصہ بھی اسی شان سے لکھا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ ایک پودنا اور ایک پودنی جوڑے کا

جوڑا کسی پیڑ پر رہتا تھا- اگرچہ جانور چھوٹا سا تھا لیکن بڑے سے بڑے جانور کو مال موجود نہ سمجھتا تھا- کسی طرف سے ایک ارنے کا جوڑا آیا- ارنی اور پودنی میں دوستی ہوگئی- ایک روز ارنی کی شامت آئی- اُس نے اُس پیڑ سے جس پر پودنے کا گھونسلا تھا بیٹھ اپنی کھجائی- جس سے تمام درخت ہل گیا- پودنا بہت بگڑا اور کہا: "اس بات سے ایک دن مردوں میں لڑائی ہوجائے گی- اس تیرے کھجانے سے میں کہہ نہیں سکتا کیا آزار مجھ کو پہنچا ہی" ارنی نے نہایت حقارت سے اُس کا جواب دیا تب پودنے نے کہا: "رہ، میں اس کی سزا کل تیرے ارنے کو دیتا ہوں" دوسرے دن صبح کو وہاں پہنچا جہاں ارنا پڑا سوتا تھا اور-

دھر بیٹھ گیا کان میں باندھ اپنے پردں کو		پھڑ پھڑ کیا، اور پردے میں نچوں کو گڑایا	

اِس کے بعد جب ارنی نے بہت منت وسماجت کی تو اُس نے چھوڑ دیا- اور ارنے سے سوا بھاگنے کے اور کچھ بن نہ آیا-

یہ قصہ از قبیل نرسری ٹیل[۵۱] ہی- جو نظیر نے اپنے لڑکپن کے زمانے میں بعض ماماوائیوں سے سُنا ہوگا، اور عقل و شعور کے زمانے میں کسی بچے کے لیے نظم کردیا ہوگا-

شکار:- نظیر کو طیُور سے اس قدر شوق معلوم ہوتا ہی کہ جہاں کہیں موقع طیُور کے ذکر کا آتا ہی وہ بے اختیار ہوجاتا ہی اور خواہ مخواہ اُن کی ایک مطوّل فہرست پیش کردیتا ہی- ایسا سمجھ میں آتا ہی کہ نہ فقط اُس نے گھر بیٹھے لال بئے، طوطے وغیرہ شوق کے جانور پال لیے ہیں بلکہ وہ اکثر اوقات باغوں میں چڑیوں کا شکار بھی کرتا پھرا ہی- وہ تمام اُن جانوروں سے واقف معلوم ہوتا ہی جو شکار کیے جاتے ہیں- اور جب اُن جانوروں کا کہیں تقریبًا ذکر آتا ہی، چوں کہ اُن کے ساتھ اُس کے نہایت لذت انگیز اور پُرلطف ایسوسی ایشن (تعلّقاتِ خیالی) رہے ہیں،

۵۱- وہ کہانیاں جو بڑی بوڑھیاں بچوں کے بہلانے کو کہا کرتی ہیں

وہ اپنے قابو میں نہیں رہتا - اگرچہ اُس کی فہرست ایک خشک تفصیل ہوتی ہی لیکن چوں کہ اُس کے پُرجوش قلب سے بے اختیاری میں نکلی ہوتی ہی، سادگی اور بے تصنعی کے مزے سے خالی نہیں ہوتی - اُن کے ذکر میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی - یہ بے ترتیبی ظاہر کرتی ہی کہ کوئی قصد تصنع کا شریک نہیں ہی - طبعی جوش ہی کہ مُنھ سے نام گنوا رہا ہی - ایک غیر محسوس طور پر شکار گاہ کا سرو سامان پیش نظر ہوتا ہی، اور معلوم ہوتا ہی کہ میاں نظیر کبھی سُرخاب کے پیچھے دوڑے جا رہے ہیں، کبھی سارس شکار کیے ہوے لیے آ رہے ہیں - کچھ رفیق بھی ساتھ ہیں - بعض رُفقا درخت پر ہریل بتا رہے ہیں - بعض فاختہ کا نشان دیتے ہیں - ان کی آنکھیں شاخوں سے متجسسانہ لڑی ہوئی ہیں - پتّے پتّے میں ڈھونڈھ رہے ہیں - لیجیے اُنھوں نے جانور کو دیکھ بھی لیا - بندوق کو چھتیاتے ہیں - ایک آنکھ بند کی ہی توڑے پر ہاتھ ہی - وہ لیجیے دن سے فیر ہوئی - ہریل بسمل ہو کر نیچے آ تا رہا - فاختہ بھی ایک طرف تڑپ رہی ہی - قرولی لے لے کر احباب دوڑے ہیں - میاں نظیر بے اعتنائی سے اور شکار کی تلاش میں دوسری طرف بڑھے جا رہے ہیں - گویا فاختہ اور ہریل کے شکار سے اُن کو چنداں خوشی نہیں - جمنا کا کنارہ ہی - ایک جوڑا سرخاب کا بیٹھا ہوا ہی - آڑ بھی موقع کی ہی - نظیر بڑے اہتمام سے نشانہ کرتے ہیں - فیر ہوتے ہی نر بسمل ہو گیا - مادہ اُڑ گئی ہی مگر سر کے اوپر منڈلا رہی ہی -

جنگ بلبلان - ذکرِ مرغان - ہنس نامہ - پودنے کی لڑائی - ذکرِ بیا - اور بعض اور متفرق اشعار سے ہم کو نظیر کے خیالی چڑیا خانے میں یہ طُیور ملے ہیں - جن میں بعض شوق کے طائر ہیں - بعض شکاری - بعض شکار -

چنڈول - اگن - ابلقے - جھپاں - بیا - دہیڑ - مینا - کلکلیاں - بگلے - طوطے (ٹوئیان - لہبر) بُلبُل - کوکلے - کویل - کھنجن - کُلنگ - سیمرغ - گرڑھ - نلکھ - سارس - حواصل - گدھ - باز - جُرّہ - شاہین - بحری - شکرہ - سیمرک - بڑنکے - ٹنٹن - مُرغے - پنڈخی - ٹوٹرو - قمری - ہربوہ - غوغائی -

بگیری۔ لٹورے۔ پپیہے۔ لال۔ چڑے۔ پودنے (پودنا پودنی)۔ پدے۔ پدری۔ بیر۔ لوے۔ تیتر۔ کبک۔ تدرو۔ ہدہد۔ بڑھیا۔ کوے۔ چیلیں۔ طوطی۔ مور۔ کبوتر۔ شام چڑے۔ جھانپو۔ ہریل سارو۔ مرغ۔ مرغی۔ چغد۔ اُلو۔ پنکھ ہوا۔ عنقا۔ ہرے۔ پنکھ۔ ٹیٹری۔ فاختہ۔ تیہو۔ ابابیل۔ چکور۔ لم ڈھینک۔ مولا۔ کرّا۔ لگھڑ۔ لگھڑی۔ چپے۔

شوق کے طائر:۔ چنڈول۔ اگن۔ ابلقے۔ بئے۔ دہیڑ۔ مینا۔ پٹی۔ بگلے۔ طوطے۔ بلبل۔ کوئل۔ قمری۔ کبوتر۔ پپیہا۔ لال۔ بٹیر۔ تیتر۔ طاؤس۔ شام چڑے۔ طوطی۔

شکاری طائر:۔ باز۔ جرہ۔ شاہین۔ بحری۔ شکرہ۔

شکار:۔ کلنگ۔ گرھ پنکھ۔ سارس۔ ٹنٹن۔ بزے۔ پنڈخی (فاختہ)۔ ٹوٹرد۔ ہریوہ۔ غوغائی۔ بگیری۔ لٹورے۔ چڑے۔ پودنے۔ پدے۔ پدڑی۔ لوے۔ کبک۔ تدرو۔ ہدہد۔ بڑھیا۔ جھانپو۔ ہریل۔ سارو۔ ہرے۔ تیہو۔ چکور۔ لم ڈھینک۔ کرّا۔ چپے۔ کھنجن۔ بڑنکے۔ پنکھ ہوا پنکھ

معمولی طیور:۔ جھپان۔ سیمرغ۔ حواصل۔ سبزک۔ زاغ۔ زغن۔ چغد۔ اُلو۔ عُنقا۔ ٹیٹری۔ ابابیل۔ مولا۔ لگھڑ۔ لگھڑی۔ (زاغ زغن چغد۔ ایک اعتبار سے شکاری طائر ہیں)۔

خانگی طیور:۔ مرغ۔ مرغی۔

سب کچھ ذکر کیا ہے لیکن بٹیر کی لڑائی کا کہیں تفصیل کے ساتھ مذکور نہیں ہے۔ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو انھیں اس جانور سے شوق نہیں تھا، یا یہ کہ اتفاقی بات ہے کہ اُس کا کہیں ذکر ان کے کلام میں نہ آسکا یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا حال لکھا ہو مگر موجودہ مجموعے سے وہ غائب ہو۔ ضمناً کہیں کہیں ذکر آیا ہے، مگر اس سے اِن کی شیفتگی اس جانور کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی مرغ کی لڑائی کا بھی کہیں شاید مذکور نہیں ہے۔ اور یہ بھی سخت موجبِ

تعجب ہے۔ چوں کہ یہ جانور خوں خوار طور پر لڑتے ہیں شاید اس وجہ سے اُن کو مرغوب نہ ہوں۔ بہر حال انکا ذکر کہیں نہیں ہے یہ بھی ممکن ہے کہ چوں کہ بعض اور اساتذہ نے مُرغ کی لڑائی کا ذکر کیا ہے، اس لیے اُنھوں نے اُس کا مذکور تحصیل حاصل سمجھا ہو۔

تیراکی:۔ انسان جب اُور جانوروں کو دیکھتا ہے کہ وہ اُس سے بعض کمالات زیادہ رکھتے ہیں، باوجودے کہ نعمت عقل سے محروم ہیں، تو اُس کو خواہ مخواہ ایک قسم کا رشک پیدا ہوتا ہے، اور مادۂ منافست جوش میں آتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ مچھلیاں پانی میں آزادی سے تَیر سکتی ہیں۔ کچھوے اپنا چین کرتے پھرتے ہیں۔ کیکڑے فراغت سے پانی کی سطح پر سیر کر رہے ہیں۔ اور اُن کو اس تیرنے میں کسی قسم کی صناعی جدّوجہد کی ضرورت نہیں۔ اُن کے جسم کی ترکیب ہی کچھ اس وضع پر ہے کہ اُن کو پانی ڈُبا نہیں سکتا۔ (غرض ایسے جانور بکثرت ہیں جو پانی میں تیر سکتے ہیں۔ بہ کثرت اُور بھی اس کی آتشِ رشک کو بھڑکاتی ہے)۔ اگر فقط آبی جانور پانی میں تیر سکتے تو شاید کچھ اُس کو تسلی ہوتی، لیکن نہیں وہ دیکھتا ہے کہ وہ جانور بھی تیر سکتے ہیں جو اُسی کی طرح خشکی میں رہتے ہیں۔ گائے بیل۔ گھوڑے۔ ہاتھی۔ شیر۔ کُتّے۔ سانپ۔ بچھو۔ اِن میں سے کوئی بھی تو ایسا نہیں جو تیر نہ سکتا ہو۔ اس سے وہ آتشِ رشک بھڑک کر چوگنی ہو جاتی ہے۔ جب مُنافست کے مادے کے اشتعال کے اِتنے سامان تھے تو وہ چُپکا کیوں کر رہ سکتا تھا۔ اِس کے علاوہ بسا اوقات اُس کو بضرورت عبورِ آب کرنا پڑتا تھا۔ غرض وہ اس نقص کی تلافی میں مصروف ہوا۔ پہلے تو اُس نے چھوٹی چھوٹی کشتیاں بنائیں۔ گھڑناویں طیار کیں۔ پھر رفتہ رفتہ اُس نے تیرنے کا فن ایجاد کیا۔ اُس نے دیکھا کہ انسان اور دیگر حیوان میں فرق یہ ہے کہ اور جانوروں کا سر کسی قدر چھوٹا ہے، اور انسان کا سر سب سے بڑا ہے۔ پس جو دقت اس کو تیرنے میں ہے اسی سر کے بڑے ہونے کی وجہ سے ہے۔ اگر کسی طرح وہ سر کو سطح آب پر رکھ سکے، تو پھر تیرنے میں کسی طرح کا اشکال نہیں۔ اس کے

رفتہ رفتہ اُس کو طریقے معلوم ہو گئے۔ پھر تو ضبطِ نفس وغیرہ کے ذریعے سے اُس نے یہ کمال بہم پہنچایا کہ بعض وقت کرامات میں اور اُس میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ مشہور ہے کہ اولیاء اللہ سطحِ آب پر سے گذر گئے اور قدم تر نہ ہوا۔ تیرنے والوں میں قدم تر نہ ہونے کا کمال تو بے شک نہیں ہے لیکن وہ سطحِ آب پر اس طرح بیٹھے جا رہے ہوتے ہیں کہ معلوم نہیں ہوتا وہ پانی پر ہیں۔ ہاتھ میں پنجرہ لیے ہوئے ہیں۔ سر پہ طوطا بیٹھا ہوا ہے۔ پتنگ اُڑا رہے ہیں سوئی میں دھاگا پرو رہے ہیں۔ حقّوں کا دم لگ رہا ہے۔

آگرےؔ[1] میں ہر سال برسات کے دنوں میں تیراکی کا تماشا ہوا کرتا تھا۔ جس طرح بنارس میں بڑھوا منگل ہوتا ہے وہاں بھی لوگ برسات کی خوشی کرتے تھے۔ جمنا کے کنارے ہزاروں خلقت کا ہجوم ہوتا تھا۔ بہت سے کنارے ہی پر ناچ رنگ کا رنگ جمائے ہوئے ہیں۔ بہتیرے اپنے احباب کو لے کر سجی سجائی کشتیوں میں بیٹھے ہیں۔ کوئی اونچی چوٹی کی رنڈی ساتھ ہے۔ ناچ گانا ہو رہا ہے۔ طبلے کھڑک رہے ہیں۔

ناؤوں میں وہ جو گُل رونا چوں میں چھک رہے ہیں	جوڑے بدن میں سجگیں، گہنے بھبک رہے ہیں
تانیں ہوا میں اُڑتیں، طبلے کھڑک رہے ہیں	عیش و طرب کی دھومیں پانی چھپک رہے ہیں
سو سو ٹھسے کے بنا کر اطوار پیرتے ہیں	

[1] بھادوں میں تیرائی ہوتی ہے۔ ناؤں پہ ملچ ہوتا جاتا ہے۔ دور دور تیرائی کا میلا رہتا ہے۔ خواجہ امیر جو نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے عہد میں اپنے والد کے ساتھ آگرے گئے تھے اس تیرائی کی نسبت اپنی کتاب معدن الجواہر میں یوں تحریر فرماتے ہیں:۔ ”خانۂ ما با دریاے جمن پُر قریب بود۔ چوں بسیر دریا می رفتیم اکثر اوقات میدیدیم کہ شناوران بسیار بشنا آشنای شوند و صنعتہاے بے شمار دریں علم بکاری برند چنانچہ شخصے بود موسوم بہ (موتی مشر) کہ صد باشاگرد داشت و قدرت و دستگاہ شناہ آں قدر داشت کہ دہ انگشت دست خود بدست دہ تا آشنای داد و شنا کردہ آں طرف دریا می برد۔ و بازہمچناں ہمراہ ایں روے آب می آورد۔ و شخص دیگر بود مسمی بہ (بھونا مشر) و ہنرش ایں بود کہ دست و پایش بہم بستہ بدریای انداختند و بہماں حالت غوّا صیہا کناں و آب رزان عبور بحر زخار بہ شکالی کیبد کرانہ موج می زد۔ و بازی آمد۔ و در انجا (اکبرآباد) رسم قدیم است کہ در ہر سال بروز معینے کہ ہست ہمہ شناوران مجتمع شدہ آب و وزیہای کنند و ہنرہا و صنعتہای خود شاں می نمایند و برکنار دریا طعامہای پزند۔ و بعد از نصف روز ہمہ شناگران آمدہ چاشت می کنند و دیگر تماشا یان ہزارہا آمدہ گل سُرخے (میلا) می سازند و آب رزاں پس از کل الطعمہ نفس راست کردہ باز بشنا مشغول می گردند و بیگاہ (شام) بخانہاے خود مراجعت می نمایند۔

اس آگرے میں کیا کیا، اے یار، پیرتے ہیں	
کچھ ناچ کی بہاریں، پانی کے کچھ لتاڑے	دریا میں مچ رہے ہیں اندر کے سو اکھاڑے
لب ریز گل رخوں سے دونوں طرف کراڑے	بجرے و ناؤ چپو ڈونگی بنے؛ نواڑے
ان جمگھٹوں سے ہو کر سرشار پیرتے ہیں۔ الخ	

جھرنے سے لے کے سہجا[1] (یا سجا) کے نالے تک اور چھتری سے لے کے برج خونی[2] اور دارا کے چوترے تک پھر مہتاب باغ سید تیلی قلعہ روضہ[3] حکیم کا باغ۔ شیو داس کا چمن سب جگہ لوگوں کا انبوہ اور تماشائیوں کا غل شور ہوتا تھا۔ جگہ جگہ پر مجلس ہے، انجمن ہے۔ میوہ مٹھائی بک رہا ہے۔ ناچ ہو رہے ہیں۔ ہر ایک مقام پر چرچے ہیں کہ آج فلاں فلاں اُستاد تیریں گے۔ فلاں کا ایک شاگرد بھی بہت ہوشیار نکلا ہے۔ کچھ دنوں میں اُستاد سے بڑھ جائے گا۔ جدھر نظر کیجیے سیر ہی سیر نظر آتی ہے۔ بڑے چھوٹے سب عمدہ عمدہ پوشاکیں پہن کر آئے ہیں عورتیں اور لڑکے اپنے رنگ برنگ کے لباس سے کنارۂ دریا کو صحن گلزار بنائے ہوئے ہیں۔ ہر شخص کے چہرے پر انبساط کا گلدستہ کھلا ہوا ہے۔

لیجیے اُستاد دریا میں کود ے۔ انواع طرح سے تیر رہے ہیں۔ اور ہر جگہ تیر رہے ہیں۔ کھڑی[4]۔ چادر۔ بند۔ ناند۔

[1] بادشاہی وقت میں سجا یا سہجا کوئی امیر عورت تھی۔ اُسی نے وہ محلہ بسایا۔ نالا اُسی کے نام سے مشہور ہے۔

[2] برج خونی پر ایک توپ رہتی تھی جو آدمی کا بل لیتی تھی۔ تب چلتی تھی۔ جمنا کے کنارے ہے۔

[3] روضہ دریا کنارے ہے، مگر اب دریا ہٹ گیا ہے اور سڑک بن گئی ہے۔ قحط میں آدمی کے بچانے کو سرکار نے بنائی۔

[4] اس مقام پر ایک امر قابلِ ذکر یہ ہے کہ وہ بند جس میں نظیر نے یہ اصطلاحیں درج کی ہیں اکثر محققین کے آگے بنظر تحقیق پیش کیا گیا مگر کسی نے تحقیقِ شافی نہ فرمائی بعضوں نے کہا اس وقت نوٹ کے کاغذات حاضر نہیں لیکن مجمل یہ ہے کہ یہ موجوں اور گردابوں و اسی قسم کی سطح دریا کی اور مختلف کیفیتوں کے نام ہیں بعضوں نے دعویٰ کیا کہ میں بتا سکتا ہوں مگر فرادی فرادی جب ہر ایک کی ماہیت دریافت کی جانے لگی تو بغلیں جھانکنے لگے۔ آخر آگرے کے تیراکوں سے پوچھا گیا لیکن بعض الفاظ سے وہ بھی نا آشنا نظر آئے۔ غرض اس تجسس و تلاش سے یہ بھی طرح ثابت ہو گیا کہ نظیر کی زبان دانی ایک دریا ناپیدا کنار جس کی نہ تھاہ ہے نہ اور چھور۔ ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء، واللہ ذو الفضل العظیم

چلوا - بینڈا - بھنور - اُچھالن - چکر - سمیٹ - مالا - بینڈا گھیر - تختہ - کسّی پچھاڑ - گرا - پانی کوئی شکل اختیار کرے ہر شکل پہ تیر رہے ہیں - لوگوں سے دادیں مل رہی ہیں -

کتنے کھڑے ہی تیریں، اپنا دکھا کے سینا	سینہ چمک رہا ہی ہیرے کا جوں نگینا
آدھے بدن پہ پانی، آدھے پہ ہی پسینا	سرووں کا یہ چلا ہی گویا کہ اک قرینا

دامن کمر پہ، باندھے دستار پیرتے ہیں - الخ

جاتے ہیں اُن میں کتنے پانی پہ صاف سوتے	کتنوں کے ہاتھ پنجرے، کتنوں کے سر پہ طوطے
کتنے پتنگ اُڑاتے، کتنے سوئی پروتے	حقّوں کا دم لگاتے، ہنس ہنس کے شاد ہوتے

سو سو طرح کا کر کر بستار پیرتے ہیں - الخ

نظیر نے برسوں یہ تماشا دیکھا تھا - اور حق یہ ہی کہ تیراکی کا تماشا آگرے سے بہتر دوسری جگہ کم ہوتا ہوگا - پھر کیوں کر گمان کیا جا سکتا ہی کہ اُس کے دل میں اُس کے سیکھنے کا جوش نہ پیدا ہوا ہو - روضہ جہاں یہ رہتے تھے، جمنا کے کنارے ہی واقع ہی - سال کے تماشے کے ماورا وہاں گھاٹ پر نہانے والوں اور تیرنے والوں کا روز اس قدر ہجوم رہتا ہی کہ معمولی سے آدمی کے دل میں بھی بے تحریک پیدا کیے رہ نہیں سکتا - چہ جائے کہ وہ تو نظیر تھے - نظیر نے گو اس فن میں وہ مرتبہ حاصل نہ کیا ہو جو اُستادوں کا ہوتا ہی لیکن پھر بھی معمولی لوگوں سے کسی قدر زیادہ جانتے تھے - اور بعض تیراکیاں عمدہ بھی اُن کو معلوم تھیں - بعض اوقات جوانی میں جب کچھ ہم عمر نوجوانوں کا ساتھ ہوا ہی تو جمنا پار بھی ہو گئے ہیں - جس جوش، اور جس واقفیت کے ساتھ اُنھوں نے آگرے کی تیراکی کا بیان کیا ہی، وہ اُن کی شناوری کی دلیلِ روشن ہی -

اکبر آباد کی تعریف میں جو نظم ہی اُس میں بھی جہاں نہرِ جمن کا ذکر آیا ہی تو بے اختیاری میں نظیر اہلِ شنا

اور شناوری کا ذکر کر گئے ہیں:-

اگر یاں کے پیرنے کا کروں وصف میں رقم — تو صفحہ عجب پیچ سے لگے پیرنے قلم
پیرے ہیں اس روش کی بہاروں سے ہو بہم — سو سو چمن بھرے ہوئے شبنم کے دم بہ دم
آجاتے ہیں نظر وہیں دریا کے درمیاں

اہلِ شنا جو کرتے ہیں سو سو طرح شنا — لہریں نشاط و عیش کی اٹھتی ہیں دل میں آ
ملتا نہیں کنار کچھ عشرت کے بحر کا — ساحل پہ جوشِ خلق سے ملتی نہیں ہے جا
ہوتا ہے وہ ہجوم بھی اک بحرِ بیکراں

علیٰ ہذا بزمِ عیش میں بے اختیار ہو گئے ہیں:-

(دریا کا سین - عورتیں) بحرِ الطافِ جمنا دریں جا ہمچناں جاری است کہ در چمنستان نسیمِ سحری و در بستان بادِ بہاری - بر ساحلِ بے خطرش ہجومِ آب کشاں و غسل سازاں، و اکثر بار چنیں بہار کہ گلعذاران جلوہ طراز می شوند، و برہمنانِ صندل سا چوں خطوطِ تلک و رشتۂ زنار صفِ دراز می بندند - طرّہ پر چینِ دل بران نمودِ موجِ مسلسل پرداز، و خاطرِ مسرورِ دل بستگاں چوں حباب کلاہ بہوا انداز - قیامِ موزوں قدان تمثیلے می جوید جز سرو و شمشاد بر کنارِ نہر نہال کدام مضمون بلند باید گردانید، و تمکنِ سیم بران تشبیہے می خواہد غیر از نسرین و نسترن بر لبِ آب جو چہ غنچۂ سخن بہ شگفتگی باید نشانید - نازنینانِ آب تا کمر دیدن سرو در بحر با صنوبر، و تریِ جسمِ نزاکت آگیں و زلفِ معنبر گل سیراب و سنبلِ تر -

(تیرائی کا میلا - تیراک) علی الخصوص وقتی کہ شناوران بشنا می پردازند و غول خود نمایاں می سازند - بہ علمِ شناوری، و از دقائقِ شناوری آن قدر آشنا کہ وسعت روے آب را فرشِ چاندنی می دانند، و ہجومِ امواج را

لہرِ سیتل پاتی - چکوۂ پر چکا بورا پوچ، و پیچِ گرداب را ہیچ - چادر از بلتے تار تار، و چار موج نیز ناچار - سر گشا طرفگی فزا، و مور چال تحیر پیرا جنبشِ دست بآں صافی کہ رشحہ نہ جنبد، و تحریکِ پا بایں خوبی کہ آب نہ رنجد - سُرخاب خجلت یاب، و بط آب آب - باقامت بہارِ کنول و نیلوفر، و بروانی چمن روان در نظر - بے کدو چناں روند کہ تعبانِ تیز رو کدو، و تا غوطہ نہ زنند آب مشتاقِ گلو - کارے می کنند کہ چیں ہر موج زبانِ تحسین، و ہنری می نمایند کہ حباب گِرد آفریں - صدائے جی بآہنگے کہ چہ چہِ بلبلاں بہ چمن، و کلاہِ رنگارنگ بنوعے کہ شگفتنِ گل ہا بہ گلشن - چندے ترانہ و دستک پرداز، و اکثرے ستار و مُنہ چنگ نواز - انبوہِ تماشائیان بر ساحل - و انواعِ سیر و تماشا حاصل -

ز جمنا عالمے صد عیش یاب است
بخوبی خوش تر از بحرِ خوشاب است
ز آبش ماند ایں جا مثلِ گُلشن
چراغ خضر تا سازند روشن

نظیر کی تعلیم و تربیت

میاں نظیر کھیل تو آپ بہت چکے۔ اب کتب کا رُخ کیجیے۔ ماما دائیوں کی گود چھوڑ کر بوڑھے شفیق استاد کے آغوش تربیت میں جگہ لیجیے۔ چار برس چار مہینے چار دن بہت ہوتے ہیں۔ اس اثنا میں (آپ کے قویٰ نے بہت کچھ ابتدائی معلومات فراہم کر لی ہیں) آپ بہتیرے پھول سونگھ چکے ہیں۔ بیلا۔ گلاب۔ چنبیلی۔ ہزارہ چنپا۔ جوہی۔ کیوڑہ۔ موتیا۔ سب پر آپ گھنٹوں دید کر چکے ہیں۔ عطر بھی بیسیوں قسم کے مل چکے ہیں۔ پھل بھی کئی طرح کے کھا چکے ہیں۔ تربوز۔ ککڑیاں۔ خربوزے۔ بیر۔ سنگترے۔ نارنگیاں۔ کوے۔ آم۔ انار۔ انگور سب کا مزہ آپ کے کام و دہن میں موجود ہے۔ سیریں بھی ہزاروں دیکھ چکے ہیں۔ تماشے بھی انواع طرح کے آپ کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ گھر کے رشتہ مندا اور بڑی بوڑھیوں کے لاڈ پیار بھی بہت ہو چکے۔ اب کیا آپ عمر بھر کھیلتے ہی رہیں گے۔ زیور اور رنگین کپڑوں سے دل سیر نہیں ہوا تو ابھی چندے انھیں رہنے دیجیے۔ لیکن خدا کے لیے کھیلنا تو اب چھوڑیے۔ کھیلنے کو بھی مطلق منع نہیں کیا جاتا۔ کھیلیے۔ لیکن گھڑی دو گھڑی پڑھ کر اور سبق یاد کر کے۔

"ابا میں پڑھوں گا لیکن پہلے آپ میری دھوم سے بسم اللہ تو کر دیجیے۔" "ہاں صاحب اس کا مضائقہ نہیں۔ اچھا بتاؤ۔ تمھاری بسم اللہ میں کتنی مٹھائی آئے؟۔ اور کون کون سی؟۔" "ابا، اور کچھ ہو کہ نہ ہو تل کے لڈو ضرور ہوں۔ اور مٹھائی دس من سے کم نہ ہو۔"

"بیٹا۔ تل کے لڈو تو دوا کی مٹھائی ہے۔ وہ بانٹنے کے مصرف کی نہ ہوگی۔ کوئی اور مٹھائی تجویز کرو۔"

"تو اچھا برفی منگوائیے۔ خوب میٹھی ہوتی ہے۔ لب چپکتے ہیں"

"اس تجویز پر تمھاری میر بھی صاد ہے"

"ابا مٹھائی بٹنے لگے تو تھوڑی مجھے بھی دیجیے گا۔ مرزا کا بیٹا جو میرے ساتھ کھیلتا ہے میں اس کو دوں گا اور دو ایک لڑکے اور بھی ہیں۔ اور ایک شخص کو اور دینا ہے وہ آپ کو نہ بتاؤں گا"

"میں سمجھا تم اپنی انا کو دینا چاہتے ہو"

"جی نہیں۔ اس کو تو آپ خود دیں گے"

"تو پھر کس کو دوگے؟"

"جب آپ مٹھائی دے لیں گے تو بتا دوں گا"

کچھ اسی قسم کی تقریر باپ بیٹے میں ہوتی ہے۔ باپ مسکراتے ہوئے فکر بسم اللہ میں تشریف لے جاتے ہیں۔ حلوائی پر مٹھائی کی فرمایش ہوتی ہے۔ فرش فروش کا سامان کیا جاتا ہے۔ دعوت کے رقعے تقسیم ہوتے ہیں۔ اہل شہر جمع ہوتے ہیں۔ شہر کے کسی مقدس ملا کے سامنے نظیر بٹھایا جاتا ہے۔ قرآن شریف رحل پر رکھا ہوا ہے۔ ملا صاحب اس سے دو چار اخلاق آمیز باتیں کرتے ہیں۔ وہ ہر بات کا معقول جواب دیتا ہے۔ ملا صاحب "ماشاء اللہ ماشاء اللہ" کہتے جاتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں تسبیح ہے۔ دوسرے میں ناسدانی ہے۔ تسبیح والے ہاتھ سے قرآن شریف کھولتے ہیں۔ اور نظیر سے سورۂ اقرا باسم پر انگلی رکھوا لیتے ہیں۔ اور اس سے کہتے ہیں "کہو اقرا باسم ربک الاعلی الذی خلق خلق الانسان من علق" بعض مخارج کے ادا کرنے سے گو نظیر قاصر ہے۔ مگر الفاظ پورے پورے ادا کرتا ہے۔ ملا صاحب کو مکرر کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی طرح تین دفعہ پڑھا کر۔ ملا صاحب نظیر کے علم کے لیے دعا کرتے ہیں اور نظیر کو شاباش اور اس کے باپ کو مبارکباد

دیتے ہیں۔ پھر چاروں طرف مبارک باد کا غل مچ جاتا ہے۔

دو چار روز تک تو نظیر کو کوئی کچھ نہیں چھیڑتا۔ لیکن جب پھر سنیچر کا دن آیا تو باپ نے اُس سے کہا کہ "بیٹا اب کتب جاؤ۔ مولوی صاحب کئی دن سے تمھارا انتظار کھینچ رہے ہیں"۔ نظیر نے کہا "میں خود حیران تھا کہ ایک ہی دن پڑھنا ہو کر رہ گیا۔ مجھ کو مُلّا صاحب نے جو کچھ پڑھایا وہ بہت بھلا معلوم ہوا"۔ اس کے بعد نظیر بغل میں قاعدہ دبا کر مکتب میں پہنچتے ہیں۔[1] اُستادِ شفیق نہایت شفقت کے ساتھ دو چار حرف بتا اور پڑھوا دیتے ہیں۔ "الف خالی۔[2] بے کی پیٹھ پر ایک نقطہ"۔ "مولوی صاحب، یہ نقطہ تو ٹھیک اُسی برفی کی طرح ہے جو میری بسم اللہ کے دن بٹی تھی"۔ "ہاں صاحب جبھی تو پڑھنے لکھنے میں اس قدر مزہ ہے"۔ "لیکن سب کو برفی ملی اور الف کو نہیں"۔ "یہ شاید بانٹنے والوں کا قصور ہے"۔ "جی ہاں کم بخت بانٹنے والے بڑے بد ذات ہوتے ہیں۔ میرزا میرا ایک دوست ہے۔ وہ لاکھ مانگتا رہا مگر اس بے چارے کو کسی نے ایک ٹکڑا بھی نہ دیا"۔ اُستاد شاگرد میں اس طرح کی باتیں بھی ہوتی جاتی ہیں۔ اور پڑھنا بھی ہو رہا ہے۔ جب اس شفقت اور مہربانی کا بھائی

لہ۔ مکتب میں اُس کے باپ نے لا کر بٹھا دیا + اک قاعدہ بھی سامنے اُس طفل کے رکھا +

سلہ اس مقام پر انشاؔ کی یہ غزل خالی از لطف نہیں :- تب سے عاشق ہیں ہم اے طفلِ پری زاد ترے + جب سے مکتب میں لگا پڑھنے الف بے تے ثے + یاد آتا ہے وہ حرفوں کا اُٹھانا مجھ کو + جیم کے پیٹ میں اک نقطہ ہے اور خالی حے + خے کی پھر شکل جو حاصل کی سی آتی ہے نظر + نقطہ جو اُس پہ لگا دیں تو ہوئی پھر وہ خے + دال ہے کبڑی سی آتا کی مری قد کی شبیہ + ہے سو یک پانچ ہے بن میٹھی ہے اور بن نقطے + ذال بھی چھوٹی بہن اُس کی ہے حرف آتون جی + ایک پر کا رسا ہے ساتھ ہے گھوم میں اُس کے + رے بھی خالی ہے زے نے پہ بھی ہے اک نقطہ + کہ مُشابہ ہے یہ تِل سے مرے رخسار تلے + سین خالی ہے شے شین پہ ہیں نقطے تین + صاد اور ضاد میں بس فرق ہے اک نقطے سے + طوے بن طُرّہ ہے اور ظوے پہ ہے اک نقطہ + عین بے عیب ہے اور کانے میاں غین ہوے + فے پہ اک نقطہ ہے اور قاف پہ ہیں نُقطے دو + کاف بھی خالی ہے اور لام بھی خالی ہے رے + میم بھی یوں ہی ہے اور نون کے اندر نقطہ + مُغلا بیگ ہے یہ واو بھی اور چھوٹی ہے + کیا خلیفہ جی یہی ایسی پھبن سے نکلے ؟ + آکے چھٹی دوا بھی لام الف ہمزہ یے + گالیاں تیری ہی سنتا ہے یہ انشاؔ ورنہ + کس کی طاقت ہے کہے کوئی جو یہ اُس کو بے +

ہو تو پھر کیوں نہ پڑھنے والے کا جی لگے۔ جمعے کو گو تعطیل کی خوشی ہوتی ہے لیکن نہ ویسی جیسی اور لڑکوں کو کہ سمجھتے ہیں قید خانے سے چھوٹے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں نظیر قاعدے کو ختم کرتا ہے۔ اُستاد کو قاعدہ ختم کرانے کا انعام الگ ملتا ہے اور سیپارۂ عم شروع کرانے کی نذر جدا۔ سیپارہ شروع ہوتا ہے تو مٹھائی آتی ہے اور نیاز ہوتی ہے۔ پیمبر کی رُوح کو ثواب بخشا جاتا ہے۔ ترقّیِ علم کی دُعا مانگی جاتی ہے۔ لڑکوں میں مٹھائی تقسیم ہوتی ہے۔ میاں نظیر خود اندر باہر خوشی خوشی تقسیم کرتے پھر رہے ہیں۔ سب سے دُعائیں لے رہے ہیں۔ سیپارہ بھی تین چار مہینے میں تمام ہوتا ہے۔ بعد ازاں حضرت سعدی کی روحِ پُر فتوح مکتب میں داخل ہوتی ہے اور نظیر کے سامنے کریما کھلتی ہے۔ یہ کب اوستاد کے خیال میں ہوگا کہ ایک زمانہ وہ بھی آئے گا کہ نظیر جس کتاب کے اشعار بلا فہمِ معنی فقط وزن کی چاٹ پر یاد کر رہا ہے اُس کی بحر کا ایسا آشنا ہوگا کہ اُس میں تضمین کی ناؤ کھیتا پھرے گا۔ وزن کا پسند کرنا طبیعتِ انسانی کا عام خاصہ ہے۔ نظیر کی طبیعت تو شاعری کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی۔ سمجھنے کی بات ہے کہ اُس کو کریما کا موزوں کلام کس قدر پسند آیا ہوگا۔ جیسے خانۂ نگین میں نگینہ بیٹھ جاتا ہے اُس کے اشعار ذہن نشین ہو جاتے تھے اور پھر کسی طرح بھولتے نہ تھے۔ دو چار روز تک ایک ایک شعر کی نوبت آئی۔ پھر تو اُس کا کچھ ایسا باہرہ کھلا کہ چار چار پانچ پانچ شعر پڑھ جاتا اور گھنٹے بھر میں یاد کر کے رکھ دیتا۔ کریما کے ساتھ ساتھ کبھی اُستاد اور کبھی بعض مکتب کے اور لڑکوں سے بیت بحثی کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا۔ اب جہاں کہیں شعر دیکھتا اُس کے اوّل اور آخر حرف پر اس کی نظر پڑتی اور اس طرح ایک غیر محسوس طور پر املا کا اُس کو خیال ہو چلا۔ بیت بحثی نے اس کے مذاقِ نظم کو کسی قدر اور گہرا کر دیا اور حافظے میں چسپیدگی کا مادہ کسی قدر اور بڑھ گیا۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ حریف سے اگر کوئی نیا شعر سُنتا ایک دفعہ میں اُس کو یاد ہو جاتا۔ کریما کے بعد مامقیماں شروع ہوئی۔ مامقیماں کے ختم ہونے پر خالق باری کی باری آئی اور آمد نامے کی آمد آمد ہوئی۔ خالق باری نے ایک مختصر

ذخیرۂ فرہنگ کے علاوہ اُس کو مختلف بحروں سے بھی استغنا کیا اور اب وہ رفتہ رفتہ ہر بحر کے اشعار کے پڑھنے پر قادر ہو چلا۔ بیت بحثی کے شوق نے اُس سے محمود نامہ اور عطائی نامہ بھی پڑھوایا۔ کتابوں میں جو شعر اُس نے پڑھے اُن کے علاوہ اُستاد سے سُنے یا اور ہم مکتبوں سے جواب میں پائے یا اور کسی بھلے مانس کو پڑھتے دیکھا وہ بھی یاد کر لیے۔ اور اب بات کرنے کے بہت سے مضحک اور حکمی بیچ اُس کو یاد ہو گئے۔ ردیف ڑا مثقلہ اور ث اور ڑھ اور ق اور ژ وغیرہ کے اشعار اُس کو بکثرت یاد تھے اور اُن کے جوابی اشعار بھی۔ اُس کا ذہن اِس چھوٹی ہی سی عمر میں ایک اچھا خاصہ مجموعہ اشعار کا ہو گیا تھا۔ اور شاید یہ اسی کا صدقہ تھا کہ بعض اوقات بعض موزوں مصرعہ بھی بے ساختگی میں اس کی زبان سے نکلنے لگا۔ اِس مذاق شعر و سخن کے بعد آمد نامے کے رُوکھے پھیکے صیغوں نے کسی قدر اُس کو تکلیف دی لیکن مکتب میں اور لڑکے بھی پڑھتے تھے اور اُن سے پیچھے رہنا یہ اپنے لیے موجب کسرِ شان خیال کرتا تھا اس لیے کسی طرح افتم و خیزم بڑھتا چلا گیا۔ اُس مشکل راہ سے گزر کر اُس نے دیکھا کہ اُس کے آگے ایک نہایت پُر فضا وعظ و نصائح کی پھلواری کھلی ہوئی ہے حضرت سعدی اُس پھلواری کے مالی ہیں۔ اور کچھ اس قسم کے گلدستے طیار کر رہے ہیں:۔

گلے خوشبوے در حمام روزے	رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری	کہ از بوے دل آویزِ تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم	و لیکن مدتے با گُل نشستم
جمالِ ہمنشین در من اثر کرد	وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

کمالِ

اِس باغ میں اس کی رُوح بہت خوش ہوئی۔ ہر گلدستے کو سونگھتا اور اپنے ذہن و خیال کے جیب و دامن کو بساتا۔ رفتہ رفتہ اُس کے دماغ میں ایک خاصہ مجموعے کا عطر پیدا ہوا جس کی خوشبو سے آج تک

لوگوں کے دماغ تازہ ہیں۔ یہ کون اُس وقت سمجھ سکتا تھا کہ یہ نونہال آگے چل کر خود اس قدر پھولے پھلے گا کہ گلستانِ سعدی اُس کے آگے گرد ہو جائے گی۔

تفصیل کہاں تک لکھی جائے۔ مختصر یہ کہ نصاب الصبیانِ ابونصرِ فراہی۔ گلستاں۔ بوستاں۔ مثنوی غنیمت۔ یوسف زلیخا۔ سکندرنامہ۔ انشائے خلیفہ۔ انشائے منیر۔ انشائے ہرکرن۔ طاہر وحید۔ بہار دانش۔ ابوالفضل۔ سہ نثر ظہوری۔ مینا بازار۔ طغرا۔ دیوانِ غنی۔ قصائدِ عرفی۔ قصائدِ خاقانی۔ قصائدِ ظہیر فاریابی۔ تحفۃ العراقین۔ قران السعدین۔ اس قسم کی کتابیں جو فارسی درسیات میں داخل ہیں اُس نے کچھ مدت میں تمام کرلیں۔ جب فارسی کی استعداد میزان منشعب سمجھنے کے لائق ہو گئی تو یہ عربی کے ڈھرے پر لگایا گیا۔ لیکن جہاں تک اس کے کلام سے مستنبط ہوتا ہے عربی میں شاید صرف و نحو سے آگے قدم نہ بڑھا سکا۔ کیوں کہ کسی مقام سے اس کی عربی کی ادبیت اچھی طرح تراوش نہیں کرتی خمسہ ہفت زبان میں عربی کا ایک شعر لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ کاتب یا راوی کی غلطی ہو۔ لیکن جس حالت میں کہ وہ مندرج ہے اُس سے تو اُس کی عربیت کی نسبت کوئی اچھی رائے قائم نہیں ہوتی۔ وہ شعر عربی کا یہ ہے:

فدای وجہک عشقی شرقا۔ دموع نہرا۔ ومن فراقک
کثیر حزنا۔ مع الہموا۔ ثقیل ہجرا۔ وکالجبالا

مبلغِ علم۔ کلام سے یہ بات اچھی طرح مترشح نہیں ہوتی کہ نظیر کا مبلغ علم کس قدر تھا، لیکن چوں کہ کسی مسئلہ فقہی یا نحوی کی طرف اشارہ نہیں ہے اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید عربیت بہت زائد نہ تھی۔ معمولی صرف و نحو کی مختصر کتابیں پڑھی ہوں تو پڑھی ہوں۔ شاید ایک آدھ رسالہ منطق کا بھی دیکھا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ فارسی کی نہ صرف درسی کتابیں پڑھی تھیں بلکہ ان کے علاوہ اس زبان کی اکثر

مشہور تصانیف اور اکثر مشہور شعرا کے کلام پر نظر تھی۔ حافظ۔ خسرو۔ جامی۔ صائب۔ سعدی۔ نظامی۔ وحشی۔ خاقانی۔ فردوسی انوری وغیرہ شعرا کے کلام سے اچھی طرح واقف نظر آتا ہے۔ چنانچہ بعضوں کے بعض کلام کی تضمین بھی کی ہے۔ فارسی میں استعداد خاصی ہے۔ کتب درسیہ ظہوری۔ طغرا۔ سہ دفتر ابوالفضل۔ غنی وغیرہ پڑھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ مختصراتِ صرف ونحو بھی پڑھا ہو تو عجب نہیں۔ بعض مقام پر جہاں فارسی اشعار لکھے ہیں زور فارسیت ظاہر ہوتا ہے۔ مرزا نوازش علی بیگ نے تو ایک خط میں ذکر کیا ہے کہ اُن کا مستقل دیوان فارسی موجود ہے۔

مکتب کی تصویر۔ مکتب کی تصویر نظیر نے لیلیٰ مجنوں میں خود کھینچی ہے۔ اس موقع پر اس کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مکتب میں اُس کے (قیس کے) باپ نے لاکر بٹھا دیا + اک قاعدہ بھی سامنے اُس طفل کے رکھا +

(بغدادی قاعدہ قیس کے زمانے میں تو تصنیف نہیں ہوا تھا۔ البتہ نظیر کو خود پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ تسامح ویسا ہی ہے جیسے لکھنؤ کے مرثیہ گو شعرا کو زنانِ اہلِ بیت کے طریقۂ ماتم و لباس و پوشاک کی نسبت اکثر واقع ہوتا ہے)۔

اُستاد کی تصویر میں خود نظیر کی تصویر نظر آتی ہے۔

اُستاد ایسے بیٹھے کہ پوچھیں وہ عشق کو	رو بے سخن میں اُن کے مرِ عاشقی کی بو
جو کچھ پڑھے تو یوں کہیں "غم کے گھر پڑو"	تختی لکھے تو بولیں: "اُسے آنسوؤں سے دھو"
معنی جو پوچھے تو کہیں "صبر و قرار کھو"	تقریر پوچھے تو یہ کہیں اُس کے رو بہ رو
"دل دے کے خوب رو کی محبت میں خوب رو"	باعث جو عشق کے تھے وہ حاضر تھے، دوستو

چاہت کی پاک بازی کا ہر دم رواج تھا
لڑکا بھی ابتدا ہی سے عاشق مزاج تھا

قیس کے تختی لکھنے کا حال نظیر لکھتے ہیں، لیکن وہ تو خود اُن کا حال ہے:-

تختی کو لے کے جب وہ قلم کو اُٹھاتا تھا
مشقِ الف میں آہ کی قدیں دکھاتا تھا
بے کی کشش میں طولِ طپش کو جتاتا تھا
نقطے کی جا بے قطرۂ آنسو بہاتا تھا
لکھنے میں میم کے جو قلم کو ہلاتا تھا
نقشِ دہنِ صنم کا اُسے یاد آتا تھا
جس وقت عین لکھنے میں دل کو لگاتا تھا
دیکھ اُس کو چشمِ یار تصور میں لاتا تھا

تختی وہ کیا تھی، دفترِ رنج و ملال تھا
لکھنے کی بات پوچھو تو اُس کا یہ حال تھا

نظیر جب علم پڑھ کر نکلتے ہیں اور اخیر کو اُسی علم کی عینک سے دیکھتے ہیں کہ آل سب کا فنا ہی تو یوں عبرت کے چشمے جاری کرتے ہیں:-

پڑھ علم کئی اس دُنیا میں گر کامل ذی ادراک ہوئے
اور لاد کتابیں اُونٹوں پر ہر معنی کے دراک ہوئے
معقول پڑھی، منقول پڑھی، ہر منطق میں چالاک ہوئے
یاں جتنے علم کے دریا ہیں اُن دریا کے تیراک ہوئے

سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں، سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے

مشہور حکیم اور بید ہوئے یا پڑھ کے علم طبابت کا
دالان کتابوں سے روکا، اور نسخوں سے صندوق بھرا
جب موت مرض نے آن لیا سب بھولے نبض اور قارورا
گو نسخے لاکھ مجرب تھے پر کام نہ آیا اک نسخا

سب جیتے جی کے - الخ

اسی رنگ میں دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

کیا کالی پیلی شکل کے، کیا گورے گل عذار — عاشق کوئی ہے اور کوئی معشوق طرح دار
عاقل حکیم و عامل و فاضل رسالدار — پنڈت، نجومی، بید، چہ ناداں، چہ ہوشیار
دو دن کی شان ہر کوئی دکھلا کے مرگیا
جیتا رہا نہ کوئی، ہر اک آ کے مرگیا

جس طرح نظیر سات زبانیں جانتا تھا گمان ہوتا ہے کہ اسی طرح وہ ہفت قلم بھی تھا۔ اس نے بعض موقعوں پر خوشنویسوں کا ذکر کیا ہے اور مطلّا مذہّب کتابیں جو لوگوں نے ہزاروں لاکھوں روپے کے صرف سے لکھوائی ہیں ان کو مخصوص بالذّکر کیا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ خوشنویسوں کی خدمت میں اکثر بہ نظرِ اصلاح جایا کیا ہے اور ان کا کمال اس کو خوش آیا ہے۔ خود بھی مدتوں خوش نویسی کا دل میں ذوق رکھا ہے۔ اچھے اچھے قطعات استادوں کے بہم پہنچاتا ہے اور بڑی محنت سے ان کی شانیں مشق کرتا ہے۔ جب سن رشد کو پہنچتا ہے بعض خوشخط قلمی کتابیں اپنے مذاق خوش نویسی کی سفارش سے خریدتا ہے اور ان پر ناز کرتا ہے[۱۵]

مرنے سے پہلے مر گئے جو عاشقانِ زار — وہ زندۂ ابد ہوئے تا حشر برقرار
کیا کاتبانِ اہلِ قلم خوش نویس کار — جتنی کتابیں دیکھتے ہو، لاکھ یا ہزار
کوئی لکھ کے مرگیا کوئی لکھوا کے مرگیا

۱۵ اکبر آباد میں میرزا نوازش علی بیگ نے نظیر کی چند نثریں دکھائیں جو بروایت ان کے خود نظیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔ خط بہت پاکیزہ نستعلیق تھا اور ایسا کہ جس پر اکثر خوش نویسوں کو رشک ہو سکتا ہے۔

جیتا رہا نہ کوئی، ہر اک آ کے مرگیا

دوسری جگہ نظیر یہ ملاحظہ کرتے ہیں کہ اگرچہ کوئی کتنا ہی علم والا ہو لیکن اسرارِ الٰہی پر کما حقہ عبور حاصل نہیں کرسکتا۔

جہاں ہیں کیا کیا خرد کے اپنے ہر اک بجاتا ہی شادیانے
کوئی حکیم اور کوئی مہندس، کوئی ہو پنڈت کتھا کہانے
کوئی ہی عاقل، کوئی ہی فاضل، کوئی نجومی لگا کہانے
جو چاہو کوئی یہ بھید کھولے، یہ سب ہیں حیلے، یہ سب بہانے

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

نظیر سات آٹھ زبانیں جانتا تھا۔ عربی فارسی کا ذکر تو ہم ابھی کر آئے ہیں۔ کہ نظیر نے اُس میں کس طرح ترقی کی۔ اُردو اُس کی مادری زبان تھی۔ اس میں اس کو چنداں محنت اور کاوش کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن چوں کہ تحصیل زبان کے ساتھ اُس کو جبلی مناسبت تھی وہ اس مادری زبان کے نکات اور خصوصیات کو اوروں سے بہت زیادہ سمجھتا تھا۔ وہ دیکھتا تھا کہ گو سب اُردو ہی بولتے ہیں لیکن بعضوں کی اُردو میں فارسی اور عربی کی آمیزش زیادہ ہے۔ بعضے ہندی اور سنسکرت الفاظ اُس میں داخل کرتے ہیں بعض اصطلاحیں بعض خاص پیشوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور اکثر پیشہ ور کچھ نہ کچھ اپنی زبان میں اور لب ولہجہ میں خصوصیت رکھتے ہیں۔ جس سے وہ فقط اپنی طرزِ تقریر سے پہچانے جاتے ہیں کہ کس پیشے کے ہیں۔ فقیروں اور بے نواؤں کا لہجہ اَور ہے۔ اور بانکوں اور شہدوں کا اَور۔ عورتیں کچھ اَور ہی طرح بولتی ہیں اور مرد کچھ اَور۔ ہندوؤں کی عورتوں کا لب ولہجہ مسلمان عورتوں کے لب ولہجے سے بالکل جدا گانہ ہے۔ ان تمام

خصوصیتوں پر نظیر کی نظر اس طرح دوڑتی تھی اور حاوی ہوجاتی تھی کہ وہ پکی عمر کو پہنچ کر اس قدر قادر الکلام ہوگیا تھا کہ جس طبقۂ ناس کی تقریر کی نقل کرنے کو کہیے وہ کر دیتا۔ اور اس خوبی کے ساتھ کہ معلوم ہوتا نقل نہیں اصل ہی۔ کبھی آپ سپنیرے بنے ہوئے ہیں۔ کبھی آپ مچھوے کے لباس میں تشریف لائے ہیں۔ کبھی مارواڑی بن کر کچھ ارشاد کر رہے ہیں۔ اُردو چوں کہ ہر زبان کو مہمان نوازانہ اپنے کاشانے میں جگہ دیتی ہی اس لیے جو شخص اُردو میں کمال پیدا کیا چاہتا ہی وہ گویا بالطبع اور کئی زبانوں کی تحصیل پر مجبور ہوتا ہی۔ اسی مجبوری اور کچھ طبیعت کی رنگینی کی وجہ سے نظیر نے اپنی توجہ کو مختلف زبانوں کے حاصل کرنے کی طرف مصروف کیا۔ وہ تھوڑے زمانے میں پنجابی خاصی طرح بولنے لگا۔ برج بھاشا میں اُس نے گوپ اور گوپیوں کی سی مہارت حاصل کی۔ پوربیوں کا لہجہ اخذ کیا۔ مارواڑیوں کی اصطلاحیں یاد کیں۔ ملک محمد جایسی کی بھاشا میں یا وہ جو تلسی داس کی ہی اُس میں کمال پیدا کیا۔

کنھیا جی کا جنم وغیرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اس شخص کو ہندوؤں کی اصطلاحوں میں پنڈتوں اور کبیشروں کا سا کمال تھا اور اسی سے یہ بھی ترشح ہوتا ہی کہ اُس کو زبانِ سنسکرت اور ہندوؤں کے مذہبی اور تاریخی امور میں اچھا خاصہ دخل تھا۔

اس کی ٹھیک تعیین نہیں ہوسکتی کہ نظیر نے یہ غیر زبانوں میں کمال کس زمانے میں حاصل کیا تھا۔ پنجابی چوں کہ دہلی میں اکثر لوگ پنجاب کے بسے ہوئے ہیں اور پنجاب ہی میں وہ شہر داخل ہی غالباً اُس کو لڑکپن ہی میں معلوم ہوگئی ہوگی۔ لیکن اور زبانیں خصوصاً سنسکرت غالباً اُس نے بعدِ فراغ کتب سے نکلنے کے بعد سیکھیں۔

جس زمانے میں نظیر تھا اُس میں مذاقِ تصوف لوگوں پر غالب تھا۔ کبیر اور گرونانک کی تعلیم نے

لوگوں کو بتا دیا تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا تصوف قریب قریب ایک ہی اور اگر غور سے دونوں مذہب کے تصوف کی چھان بین کی جائے تو آل ایک ہی ٹھہرتا ہے۔ اس لحاظ سے اکثر صوفی خیال مسلمان بعض اوقات ہندو جوگیوں اور مذہبی پیشواؤں اور عالموں سے ملتے اور واقعی معقول استفادہ کرتے تھے۔

ہمارے شہر عظیم آباد میں ایک پرانے آدمی شاید کوئی سو برس سے زیادہ عمر کے رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک دفعہ باتوں ہی باتوں میں ایک فقیر کا ذکر کیا جن کا ہمزہ علی شاہ نام تھا۔ انھوں نے بیان کیا کہ یہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ یہاں آن کر شاہ ارزاں صاحب کی درگاہ پر رہ گئے۔ بہت ہی کامل درویش تھے۔ اُن کا اکثر معمول تھا کہ ہندوؤں کی کتھا میں شریک ہوتے۔ ہندو بھی ان کی بڑی آؤ بھگت کرتے اور ممتاز جگہ دیتے۔ کتھا کہنے والے خاص کر ان کی طرف خطاب کرتے اور یہ بہت ہی محظوظ وہاں سے واپس آتے۔

تذکرۂ گلشن بے خزاں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت شاعر بھی تھے چنانچہ صفحہ ۲۸۴ میں صاحب تذکرہ میاں باطن لکھتے ہیں کہ ہمزہ تخلص لا اعلم۔ از فقرائے شاہجہاں آباد۔ سیرگاہ ان دنا کی بلدۂ عظیم آباد درویش سخن کا غذ کے تکیے میں اس طرح کرتا ہے حق کی یاد۔ ہمزادِ طبع سُوالِ سخن کو یوں کرتا ہے یاد۔

ہائے کس کس کے تئیں بیٹھ کے ہم یاد کریں　　　غم مجنوں کریں یا ماتم فرہاد کریں

اس ذکر سے مقصد یہ ہے کہ کچھ اسی طرح کا مذاق میاں نظیر کا بھی ہوگا تعلیم کے تعلق سے چوں کہ ہندوؤں کے ہاں ان کو رہنے کا زیادہ اتفاق ہوا اس سے شاید یہ مذاق اور چمکا ہوگا۔ علمائے ہنود کی صحبت، اور ذہن و ذکا کی تیزی، اور حافظے کی قوت، اور تلاش کی اشتہائے صادق نے ان کے ذخیرۂ دماغ کو تھوڑے ہی دنوں میں معلومات کافی سے بھر دیا ہوگا۔

ہرچند ہم نظیر کے حالاتِ تعلیم میں صدرا اور شمس بازغہ کا کہیں ذکر نہیں پاتے۔ اُس کے آگے کبھی فقہ و احادیث کی موٹی موٹی کتابیں کُھلی ہوئی نہیں دیکھتے۔ وہ منطق اور معقولات کی موشگافیوں میں اُلجھا ہوا نظر نہیں آتا۔ وہ علمِ کلام اور علمِ عقائد میں غوطے لگاتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن یہ خدا کی دین ہے۔ اس میں کسی کا اجارہ کیا ہے ۵

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال		کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے	

وہ اگر کسی کو بے محنت گھر بیٹھے تمام علوم کی دولتیں عطا کرے تو اُس کی قدرت سے کیا بعید۔ اکثر بزرگوں کے حالات میں مذکور ہے کہ اُن کی خضر سے ملاقات ہوئی جنھوں نے ایک غیر معمولی طریقے سے تمام علم اُن کو گھول کر پلا دیا۔ ہم کو وجودِ خضر سے انکار نہیں اور نہ اس میں کلام کہ بعض حضرات کو اُن سے یہ غیر معمولی فیض پہنچا بھی ہے، لیکن اس کثرت سے جو روایتیں مشہور ہیں وہ یقیناً محلِ تامل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں بہت سے ایسے ذہین ہو گزرے ہیں کہ جنھوں نے اپنی فطری بے چینی اور سیماب وشی سے جو اذکیا کا خاصہ ہے زمانۂ تحصیل میں رسمی طریقے پر زیادہ علم حاصل نہیں کیا، لیکن اُس جبلّی مادّے کی وجہ سے پھر جو آگے چل کر اُن کو توجہ ہوئی ہے تو رسمی طریقۂ تحصیل میں عمر بھر جانفشانیاں کرنے والے بیٹھے ہی رہ گئے ہیں اور یہ اُن سے بمراحل آگے نکل گئے ہیں۔ اگر ایسے اذکیا کا میلانِ خاطر کچھ مذہب اور تصوّف کی طرف ہے تو اُنھی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ خضر سے اُنھوں نے تعلیم پائی ہے۔ پس ان صورتوں میں خضر حقیقت میں نام ہے اُن فطری قویٰ کا جن کو ظلماتِ استعداد سے بعض خاص اوقات میں فعل کی روشنی میں جلوہ گر ہونے کی توفیق ہوتی ہے۔ یہ خضر نظیر کی استعداد کے ظلمات میں بھی تشریف رکھتے تھے، اور یہ انھی خضر کا تصرف ہے کہ بغیر اس کے وہ باضابطہ تعلیم کا قدیم کورس تمام کرے وہ تمام علوم میں ایک خاصی مہارت رکھتا تھا۔ علم ہیئت کے اکثر مسائل جن کی

معمولی ریاضی دانوں کے فلک کو بھی خبر نہیں اُس کو ازبر تھے۔ وہ علمِ معانی و بیان میں ایک معقول معلومات رکھتا تھا۔ اچھے اچھے قابل اور ذی علم لوگوں کی صحبتوں میں بیٹھتے بیٹھتے ہر علم کے مُتعارف اور معمولی مسائل اُس کو نوکِ زبان ہوگئے تھے۔ وہ ایسی ویسی صحبتوں میں بیٹھا ملتا تو لوگوں کو مُشکل سے معلوم ہوتا کہ وہ علومِ عربیہ کا پُورا عالم نہیں ہی۔ ہر چند طب اُس نے نہ پڑھی ہو لیکن معلوماتِ طبّی اُس کی کم نہیں معلوم ہوتی۔ ہم اُس کے شاگردوں میں ایک طبیب کو بھی پاتے ہیں جس کا نام مانک چند اور عُرف جتی جی تھا۔ یہ شہر کا ایک نامی طبیب تھا اور اخیر عُمر میں نظیر کے خاندان کے لوگوں کا علاج اُسی کے ہاتھ سے ہوتا تھا۔

حق تو یہ ہی کہ سب سے بڑی تعلیم یہ ہی کہ انسان کے ذہن میں علم کی بھُوک پیدا ہو جاے اور اس طرح کہ ہر وقت بھڑکی رہے۔ عالم کے جس قدر اجزا ہیں ہر جزو سے اُس کے ذہن میں حرکت پیدا ہو جاے۔ اُس کی جس پھُول پر نظر پڑے وہ اُس پھُول کو پھول نہ سمجھے بلکہ کاتبِ قدرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا چند ورقوں کا ایک نادر رسالہ۔ جس پتے پر نگاہ ڈالے سمجھے کہ دفترِ معرفت ہی بقول سعدی ؎

برگِ درختان سبز در نظرِ ہوشیار	ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

ہر واقعے اور ہر ماجرے کو دیکھ کر بیسیوں سوالات دل میں پیدا ہونے لگیں۔ چوں و چرا عقل کی زبان پر ہو۔ کوادر کجا اور این و متی تفتیش و تفحص کا تکیہ کلام ہو۔ اگر یہ کیفیت طالب میں پیدا ہو گئی ہی۔ اور علومِ رسمیہ سے ایک حرف بھی اُس کو معلوم نہیں تو وہ ایک بڑا عالمِ متبحر ہی اگرچہ اُس کا علم قطرے سے زائد نہیں، اور وہ فلکِ معلومات کا آفتاب ہی ہر چند وہ ایک ذرّے سے کم رتبہ ہی۔ نظیر میں ہم اِس کیفیت کی ایک علی نظیر پاتے ہیں گو اُس نے پڑھا مکتب ہی میں لیکن اُس نے کبھی اپنی آنکھوں کو اُنھی چند ورقوں میں محدود نہیں رکھا۔ وہ مکتب میں بیٹھا ہوا ہی تو سبق کے علاوہ اپنے ہم مکتبوں کے عادات و خصائل پر غور

کر رہا ہی۔ کوئی کسی کا منہ شرارت سے چڑا رہا ہی تو یہ اُس کے لیے بدرجہا چ کے ایک دل چسپ چیستانی شعر کا کام دیتا ہی جس کے مطالب پر آہستہ آہستہ غور کرنے لگتا ہی۔ اور آخر ایک صحیح مطلب ذہن سے پیدا کر کے رہتا ہی۔ اُستاد پر بیٹھے بیٹھے غنودگی طاری ہوتی ہی اور اس رحمت نشان غفلت سے معصوم ہم سبقوں میں جو ایک خاص قسم کی مسرّت پھیلتی ہی اور چپکے چپکے مختلف مشاغلِ لایعنی اور افعال تفریحِ انگیز و شرارت خیز کا دفتر کُھل جاتا ہی، تو نظیر کے آگے انسانی طبیعت کا ایک دل چسپ مسئلہ پیش ہو جاتا ہی جس کو بڑی رغبت سے وہ سُلجھانے لگتا ہی۔ غرض اِس قسم کی تعلیم تھی جس کا قیمتی سرمایہ لے کر وہ بازارِ دنیا میں معلومات اور تجربوں کی خریداری کے لیے وارد ہوا۔

مکتب ہی کے قیام کے زمانے میں نظیر نے اُن تعلّقات پر بھی غور کی جو اُستاد اور شاگردوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ اُستادوں میں اکثر وہ بھی ہوتے ہیں جن کی چلبلی طبیعتوں کو عموماً عشقیہ قطعے پسند آتے ہیں، اور جن کی چلتی پھرتی ہوئی نگاہیں زیادہ تر حُسن نگار وصلیوں سے لڑی رہتی ہیں۔ ایسے اُستادوں کی خوش قسمتی سے شاگردوں کے زمرے میں بھی بعض ایسے منتخبِ روزگار ہوتے ہیں جن کے مُصحفِ رخ کی طلائی لوح اور مینا کار جدولوں اور نقش و نگار میں کاتبِ قدرت یاقوت رقمانہ صنعتیں صرف کیے ہوتا ہی۔ ایسے اُستادوں اور شاگردوں کے باہمی برتاؤ ایک ذہین اور فہیم اور تیز ہوش لڑکے کے لیے بیشک نہایت تفریح بخش اور دل آویز تماشے ہوتے ہیں۔ نظیر نے اِس قسم کے بیسیوں تماشے دیکھے تھے۔ بعض محض مُعصومانہ تھے، اور بعض کسی قدر نفرت کو بھی جوش میں لاتے تھے۔ خود لڑکوں کے بھی آپس کے برتاؤ بعض وقت بڑے زور سے اُس کی عبرت شکار نگاہ کو اپنی طرف کھینچتے تھے، اور دیر تک محوِ تماشا رکھتے تھے۔ وہ اِن برتاؤں سے بھی کبھی مسرّت، اور کبھی نفرت حاصل کیا کرتا تھا۔ معصومانہ روشیں میل جول اور اختلاط و ارتباط کی اِس کو بھاتی

تھیں، اور شرارت انگیز فطری چلبلا پن اُس کو خوش آتا تھا۔ لیکن جب کبھی بعض ناپاک خیالات کا فوارہ اُبلتے دیکھتا تھا تو وہ متنفر بھی اتنا ہی ہوتا تھا۔ اِس قسم کے ناہموار لڑکوں سے بات کرنی تو درکنار اُن کا پاس بیٹھنا تک اُس کو ناگوار گزرتا تھا۔ اپنی اسی نفرت کو ہنسی میں ڈال کر بعض نظموں میں نہایت خوش طبعانہ طور پر اُس نے ظاہر کیا ہی۔ اِس نظم میں مدرسے کے علاوہ کسی قدر خانقاہ۔ شیوالے۔ اور زمن ر وغیرہ کا تجربہ بھی شریک ہی

لڈو میں نہ پیڑوں میں نہ اولوں میں مزا ہی	جو مردِ مُجرّد کے . . . میں مزا ہی

اُس زمانے میں تعلیم میں ریاضت بھی داخل تھی۔ اب کی طرح لوگوں کے خیالات نہ تھے۔ اُس وقت میں مرد کا لفظ آیا اور اُس کے ساتھ سپاہی کا اسوسی ایشن ذہن میں پیدا ہوا (یعنی تمام سروسامانِ سپہ گری ذہن میں خطور کر گئے) - ہر مرد کے لیے ضرور تھا کہ وہ کچھ فنِ کشتی میں دخل رکھتا ہو۔ کچھ پھینک جانتا ہو۔ لُٹھیت ہو۔ مُگدر کے پھری کا شوق رکھتا ہو۔ اکھاڑے میں روزانہ ڈنڈ پیلتا ہو۔ جوڑی ہلاتا ہو۔ تلوار۔ بانک۔ پٹا۔ بلم۔ بنرم۔ کسی ہتھیار کے چلانے میں بند نہ ہو۔ نظیر نے بھی اپنی بساط بموجب کچھ کچھ اِس فن میں مہارت پیدا کی تھی۔ ورزش کی تو اُس کو یہاں تک عادت پڑ گئی تھی کہ ہونے کو بوڑھا ہو گیا لیکن اِس معمول کو نہ چھوڑا۔ اخیر عمر میں جب کچھ نہیں ہو سکتا تھا تو فقط دیوار ہی کی ورزش کر لیتا تھا۔ اسی ورزش کی بدولت بڑھاپے میں بھی یہ دم وخم تھے کہ ایک جگہ ارشاد کرتے ہیں:-

اے یار سو برس کی ہوئی اپنی عُمر آکر	اور جھرّیاں پڑی ہیں سارے بدن کے اوپر
دکھلاتے جس گھڑی ہیں میدان میں زور جاکر	رُستم کو بھی سمجھتے اپنے نہیں برابر
اب بھی ہمارے آگے، یارو، جوان کیا ہی۔	

جن دنوں نظیر کی اُٹھتی جوانی تھی یہ اپنے زور میں کس کو مال موجود سمجھتے تھے۔ زور جوانی کی اُمنگوں میں

کچھ دنوں یہ بانکے بھی بنے رہے اور اکثر شہر کے بانکوں کے ساتھ نشست و برخاست اور گفت و شنود رہتی تھی چنانچہ اُس ملنے میں جو اُن کے محاورے اِن کی زبان پر چڑھ گئے تو پھر تا عمر نہ بھولے۔ جہاں کہیں لڑائی یا پہلوانی یا ڈینگ یا تعلی کا ذکر آجاتا ہے تو پھر یہ خاصے بانکے ہیں۔ جن دنوں یہ بانکے تھے اُن دنوں کا حال وہ یوں تحریر فرماتے ہیں:-

بانکے بھی ہو کے ہم نے اِس دید کو اُڑایا
شمشیر اور سپر کو اک عمر کھڑکھڑایا

بانک و پٹا و بلم گدکا و لٹھ پھرایا
جھمکا تمہارا اس دم ہم کو جو یاد آیا

اک دم کو آگئے ہیں، منہ مت چھپائے ہم سے
ٹک ہنس کے اوپری رو آنکھیں لڑائے ہم سے

کشتی میں کتنی مدت ہم نے بدن کو توڑا
سو گلبدن کے تن کو من مانتا مروڑا

جو ڈھب تھا اس ہنر کا کوئی نہ ہم نے چھوڑا
اب خوب رو کا پیارے دنیا میں دیکھ توڑا

اک دم کو آگئے ہیں۔ الخ

پھر دوسرے خیال میں۔ بانکوں اور سپاہیوں کا ذکر یوں فرماتے ہیں:-

یا ہو سپاہی بانکا ترچھا بڑا اکھایا
بل دار باندھ چیرہ، طرّے کو جگمگایا

کھیتوں میں جا کے کودا، لاکھوں کے تئیں بھگایا
جب منہ اجل کا دیکھا پھر کچھ بھی بن نہ آیا

یکتا شجاع بہادر صفدر رہا، تو پھر کیا

گھوڑا اٹھا کے ڈوبا فوجوں میں ہو دل آور
مارے طمنچے بھالے، کھائے کٹار جمدھر

مارا قضا نے بھالا جس دم فنا کا آ کر
پھر مردمی شجاعت سب ہو گئی برابر

خود و سلاح، چلتہ، بکتر ہوا، تو پھر کیا

یا خانہ جنگی لڑکر کھایا بدن میں ٹانکا — مونچھوں کو تاؤ دے کر سوذوت دھات بانکا
جب گھوڑ کر قضا کے بانکے نے آکے جھانکا — ٹیڑھا رہا نہ ترچھا گن ڈار ہا نہ بانکا

تیغا سپر قرابیں جمدھر ہوا، تو پھر کیا

آزادوں کے محاورے میں یہ بند بھی قابلِ ملاحظہ ہے:-

ہر آن کھڑا کے سے اِس ڈھب کا لگا رگڑا — جوشن کے کھڑک اس کی ہو بند سبھی دگڑا
چٹکان چڑھا گہرا اور باندھ ہرا اگڑا — کیا سیر کی ٹھہرے گی تُک چھوڑ کے یہ جھگڑا

کونڈی کے نقارے پر خشکے کا لگا ڈنکا
نت بھنگ پی اور عاشق دن رات بجا ڈنکا

اس بند میں بھی پہلوانانہ مذاق ہے:-

جاڑا تو اپنے دل میں تھا پہلوان جھجھاڑا — پر ایک تِل نے اُس کو رگ رگ سے ہے اکھاڑا
جس دم دل و جگر کو سردی نے آلتاڑا — خم ٹھونک دوں ہی ہم نے جاڑے کو دھر پچھاڑا

تن پھر ایسا بھیگا جب کھائے تِل کے لڈو

بلبلوں کی لڑائی اور ریچھ کے بچّے کے بیان میں جو بند کشتی سے متعلّق آئے ہیں وہ نقل ہوچکے ہیں۔ اُن میں بھی پہلوانانہ مذاق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، اور الفاظ و ترکیبیں سب مناسبِ مضمون ہیں۔

پہلوان کا روپ۔ دیدبازی کے تماشا گاہ میں بہادری کے رُوپ یوں بھرتے ہیں:-

دیکھا جو حُسن بھاری شہزور یا جباڑا — تو پہلوان بن کر کھودا وہیں اکھاڑا

ڈنڈ پیل، بھان، مگدر، لیزم سے خم کو جھاڑا
اِس پیچ سے ہی گُل رو ہیٹے کو دھر پچھاڑا

سو مکر و فن بنانا، سو رنگ رُوپ بھرنا
عاشق کو ہر طرح سے خُوباں کی دید کرنا

لکڑی باز کا روپ:-

جو حُسن تھا چمکتا قاتل کا مثل کتّا
بانک اور پٹا ہلایا محنت سے ہو کے لتّا
تو لکڑی باز بن کر پھینکا پھری بھی گتکا
راوت ہی بن کے مارا اُس پر بھی اپنا ہتّا

سو مکر و فن بنانا۔ الخ

بانکے کا روپ:-

دیکھا جو حُسن بانکا تو بن کے ٹیڑھے بانکے
کر خانہ جنگی اُس سے کھائے بدن پہ ٹانکے
تیغ و سپر، طمنچے باندھے ہیں سب جہاں کے
ٹانکے تو کھائے لیکن پھنکے بھی خوب پھانکے

سو مکر و فن بنانا۔ الخ

خیبر کی لڑائی میں بھی معرکے کو خوب لکھا ہے اور اُس سے بھی پہلوانانہ مذاق ٹپکا پڑتا ہے۔

نظیر کی جوانی

جوانی کا زمانہ ایک ایسا سحر انگیز اور جادو تاثیر زمانہ ہی کہ اُس میں بھدے سے بھدے اور سست سے سست آدمی کے خیالات میں بھی بلند پروازیاں آجاتی ہیں۔ ہر چند بدصورت ہو مگر وہ خواہ مخواہ آئینے کی تلاوت میں مصروف ہوتا ہی۔ بالوں میں ہر وقت تیل پڑتا ہی۔ کنگھی ہوتی ہی۔ بیسن سے مُنھ دھویا جاتا ہی۔ رنگ کی صفائی کی دوائیں تلاش ہوتی ہیں۔ بلا ناغہ چوک کی سیر ہوتی ہی۔ دوستوں کا جمگھٹا رہتا ہی۔ تاش ہو رہا ہی۔ چوسر بچھی ہوئی ہی۔ ایک طرف ستار چھڑ رہا ہی۔ دوسری طرف کوئی الاپ رہا ہی۔ قہقہے چھت اُڑا رہے ہیں۔ لطیفوں کی دھوم کان پڑی آواز سُننے نہیں دیتی۔ حقیقت یہ ہی کہ جوانی کے آنے سے لڑکپن کے معصومانہ خیالات پر ایک خاص برقی اثر پھیل جاتا ہی۔ اور ایک نئی دنیا نگاہوں کے سامنے ہوتی ہی۔ بس طرح آفتاب کے قریب نصف النہار پہنچتے پہنچتے کرنوں میں ایک خاص گرمی اور دھوپ میں ایک خاص تابانی آجاتی ہی اسی طرح جوانی کے ترقی کرنے سے خواہشوں میں ایک خاص تیزی، خیالات میں ایک خاص جودت، اور ارادوں میں ایک خاص قوت آجاتی ہی۔ نظیر جس کو ہم ایک غیر معمولی طبیعت کا آدمی ظاہر کر چکے ہیں کیوں کر اِس عموم سے مستثنٰے ہو سکتا ہی۔ اُس میں بھی تمام وہ خواہشیں موجود تھیں جو جوانی میں عموماً پائی جاتی ہیں، بلکہ عطیاتِ فطری کے غیر معمولی ہونے سے وہ خواہشیں بھی اُس کی ذات میں اَوروں کی بہ نسبت غیر معمولی تھیں۔ ہر چند وہ، جیسا کہ خود کہتا تھا، کریہ منظر تھا مگر کیا جوانی میں اس کراہت منظر نے ایک منٹ کے لیے بھی اُس کو آئینہ دیکھنے سے باز رکھا۔ وہ آئینہ میں معائنۂ جمال کی اس طرح مزاولت کرتا تھا کہ جیسے

کوئی وظیفہ جی وظیفے کی صبح ہوئی ہے۔ بستر سے اُٹھتے ہی اُس نے سرہانے سے آئینہ اُٹھایا ہے۔ خواب کے خمار سے چہرے پر جو ایک خاص اثر پیدا ہوا ہے اُس کو مختلف پہلوؤں سے دیکھتا ہے۔ رومال سے چہرے کو پونچھتا ہے اور اُس کو ایک مائیقر اُزینہ نفاست پر لے آتا ہے کہ حوائج سے فارغ ہونے اور مُنھ ہاتھ دھونے تک دوستوں کو نفرت کی وجہ باقی نہ رہے۔ بلکہ اگر کسی دل میں اُس کی محبت ہو تو وہ اُس خاص خوش نما خمار آلودہ حالت کو رغبت اور خوشی کے ساتھ دیکھے۔

ہرچند آغازِ جوانی میں خود بینی اور خود نمائی آئینہ سامنے لائی ہو لیکن آگے چل کر بلند نظری کے باعث اُسی آئینے میں اُس کو خدا بینی اور خدا نمائی کے جلوے بھی نظر آنے لگے۔ وہ اپنی کم زوری کو جانتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ خود بینی اور خود نمائی تھوڑی بہت ہر انسان میں ہے، اور بعض حالت میں اعتدال کے ساتھ کچھ انسانی سوسائٹی کی زینت اور ترقی کے لیے یہ کم زوری ضروری بھی ہے۔ پس وہ کسی کو اتفاقاً آئینہ دیکھنے سے سختی کے ساتھ منع نہیں کر سکتا تھا۔ وہ لوگوں کو اس جائز خواہش کے پورا کرنے کی صرف اجازت ہی نہیں دیتا، بلکہ ان کو تاکید کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ خیال کے کسی قدر بلند کرنے سے اس ادنیٰ خواہش سے بھی کتنے فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ الانسان عالم اصغر۔ اس قسم کے بلند صوفیانہ اور حکیمانہ خیالات کے مخفی معانی پر آئینہ بہت کچھ روشنی ڈال سکتا ہے۔ کہتا ہے:۔

لے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ
صورت میں اپنی قدرتِ پروردگار دیکھ

خالِ سیاہ اور خطِ مشک بار دیکھ
زلفِ دراز و طُرّۂ عنبر نثار دیکھ

ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ

اے گُل، تو اپنے حُسن کی آپی بہار دیکھ

آئینہ کیا ہی؛ جان، ترا پاک صاف دل — اور خال کیا ہیں؛ تیرے سویدا کے رُخ کے تِل
زُلفِ دراز فہمِ رسا سے رہی ہی مِل — لاکھوں طرح کے پھُول رہے ہیں تجھی میں کھِل

ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گُل، تو اپنے حُسن کی آپی بہار دیکھ

نرگس وہ کیا ہی؛ جان، تری چشمِ خوش نگاہ — اور سرو کیا ہی؛ یہ ترا قدِ دراز، آہ!
گر سیرِ باغ چاہے تو اپنی ہی کر تو چاہ — حق نے تجھی کو باغ بنایا ہی، واہ واہ!

ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گُل، تو اپنے حُسن کی آپی بہار دیکھ

بیدل نے بھی اس مضمون کو ایک مطلع میں کس لُطف کے ساتھ ادا کیا ہی:-

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیرِ سرو و سمن درآ — تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ درِ دل کشا بچمن درآ

نظیر حوائج سے فارغ ہو کر مُنھ ہاتھ دھو کر چوکی کے فرش پر آن بیٹھا ہی۔ گو رومال سے مُنھ پونچھ چکا ہی لیکن اُس کو ہاتھ سے الگ نہیں کیا۔ خدمتگار نے آئینہ سامنے لا رکھا ہی۔ آنکھوں کے گرد کچھ تری رہ گئی ہی، اُس کو رومال کے گوشے سے دُور کرتا ہی۔ بھنوؤں کے بال کچھ اُلجھ سے گئے ہیں اُن کو سلجھاتا اور ہموار کرتا ہی۔ بھیگی ہوئی مسیں مکرر بھیگی ہیں، اور اُن میں دونی بہار پیدا ہوئی ہی۔ تھوڑی دیر تک نو دمیدہ بالوں کی نوکوں پر پانی کی ننھی ننھی بوندوں کی پُرلطف کیفیت میں وہ ایسا محو ہوتا ہی کہ اُس کے دل سے اُن کے دور کرنے کا خیال بالکل جاتا رہتا ہی۔ پھر وہ اِس بیخودی سے چونکتا ہی اور عُجلت کے ساتھ رومال کو مونچھوں تک

لے جاتا ہی۔ چہرے کی صفائی کے بعد وہ اپنے جمال پر مکرر نظر کرتا ہی اور کتابی چہرے کی کتاب کو نظرِ ثانی سے زیادہ منظورِ نظر بناتا ہی۔ بالوں میں تیل ڈالتا ہی۔ کنگھی سے پہلے اُن کو سُلجھاتا، پھر مانگ نکالتا، پھر اُس کی راستی کو آئینے میں جُھک جُھک کر ایک خاص ادا سے پیشانی میں بل ڈال ڈال کر بھنووں کو تان تان کر نگاہ کو سمٹا سمٹا کر، دیکھتا ہی۔ اگر مانگ سیدھی نہیں نکلتی، دو دو تین تین دفعہ بالوں کو منھ پر لٹکاتا، جھاڑتا، اور دونوں بھنووں کے بیچ سے شہادت کی اُنگلی کو سیدھ میں لے جا کر سیدھی مانگ نکالتا ہی۔ پھر الگنی کی طرف رُخ کرتا ہی۔ شبینہ کپڑوں کو جسم سے دور کرتا ہی۔ نئے کپڑے بدلتا ہی۔ پھر نظر کبھی شانے پر ہوتی ہی کبھی سینے پر۔ چُنی ہوئی آستینیں دامنِ گل چیں بنی ہوئی ہیں۔ چُنے ہوئے دامن سے پھول لپٹے ہوئے ہیں۔ خوش وضعی کے اِس باغ میں بیٹھ کر وہ مشک بو حقے سے دماغ کو معطر کرتا ہی۔ بعض زندہ دل احباب اُس سے ملنے کو آگئے ہیں۔ اُن کے ساتھ بیٹھ کر کچھ ناشتا کرتا ہی۔ پھر اپنے ہاتھ سے نہایت سلیقے سے پان بنا کر اُن کو بھی کھلاتا ہی آپ بھی کھاتا ہی۔ بات کرتا جاتا ہی اور کبھی کبھی نظر بچا کر ہونٹوں کی مصنوعی سُرخی کو بھی دیکھ لیتا ہی۔ باتوں میں اس کے لباس و پوشاک سے زیادہ بناؤ ہی۔ ہر فقرہ زعفران زارِ کشمیر ہی۔ احباب ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جاتے ہیں۔ نقلوں پہ نقلیں ہو رہی ہیں۔ ہا لطف کی کوئی انتہا نہیں پھبتیوں کا کوئی شمار نہیں۔ ہر ایک شخص ضلع جگت کا بادشاہ معلوم ہوتا ہی۔ مگر نظیر کے آگے کسی کی چلتی نہیں۔

شاذ ہی کوئی منحوس دن ایسا ہوتا ہوگا جس میں نظیر کے ہاں احباب تشریف نہ لاتے ہوں۔ کیوں کہ اِس کے ہاں خوش گپیوں کی ایسی چاٹ تھی کہ بے عذرِ قوی خوش مذاق اور زندہ دل نوجوان اِس چاشنی کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ لیکن آدمی ہی تو ہی۔ اگر کسی سبب سے کبھی وہ حضرات نہ آتے تو نظیر بہ تقاضائے اُنس مضطر ہو کر خود جاتا۔ اگر گھر میں ملتے تو اُن سے بیٹھ کر دو میں باتیں کرتا، نہیں تو اُن کی خیریت دریافت کر کے

چلا آتا۔ اور بعض روز اگر نہ جاسکتا تو گھر میں بیٹھ کر کتابوں سے جی بہلاتا۔ کتابیں جو اس زمانے میں اُس کے پیشِ نظر رہتی تھیں اُن سے جُدا گانہ تھیں جو وہ مکتب میں پڑھا کرتا تھا۔ ہر چند مکتب میں بھی بعض دواوین اُس نے پڑھے تھے مگر اب وہ کہاں مزہ دے سکتے تھے۔ کچھ تو جبلت میں عشق و عاشقی۔ اُس پر جوانی کی تائید۔ اب لگا وہ دن رات عاشقانہ پُرجوش خیالات میں محو رہنے۔ باتیں بھی کرتا تو عشق و حُسن کی اور کتابیں بھی پڑھتا تو عشق و حُسن کی۔ مثنویاں وہ زیادہ دیکھتا تھا جن میں عشق و محبت کی داستانیں اُس کے شوق کو اُبھار کر، جُدائی کی مُصیبتوں میں ڈال کر، جذبِ صادق کے اثر سے خیالی طور پر اُس کو وصل کے مزوں سے آشنا کرتی تھیں۔ دواوین کی وہ زیادہ مُزاولت رکھتا تھا جن میں غزلوں کی خیالی بزم میں اُس کو معشوق سے نت نئے طریقے سے مکالمے کا لُطف حاصل ہوتا تھا۔ وہ ہر شاعر کو اپنے دلی خیالات کا ترجمان پاتا تھا۔ بازار گیا ہے۔ کوئی حسین عورت اُس کو نظر آگئی ہے۔ اُس کی نرگسی آنکھیں اُس کے دل کو تڑپا گئی ہیں۔ گھر میں دیوانوں کی ورق گردانی کرتے کرتے وہ دیکھتا ہے کہ کسی غزل میں ہو بہو اُسی حسین کی رنگین تصویر کھنچی ہوئی موجود ہے۔ کسی شب کو کسی جادو نظر کے حُسن کی یاد میں شب کی تنہائی نے اُس کو بہت ستایا ہے اور اُس کی آنکھوں سے مایوسی کے جھونکوں نے نیند کو اُڑایا ہے۔ وہ دوسرے ہی دن صُبح کو اُٹھ کر اپنی تمام رُوداد شبینہ کسی شاعر کی بیاض میں بعینہ قلم بند پاتا ہے۔ اُس زمانے تک اُردو کی شاعری نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی۔ گو سودا اور مِیر مطلعِ شُہرت پر آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک رہے تھے لیکن فارسی کے شعراء کے آگے ان کا چراغ جلنا مُشکل تھا۔ اُردو کے گنتی کے دو چار شاعر فارسی شُعراء کی ایک پُوری رجمنٹ کو کیوں کر بھگا دے سکتے تھے۔ اُردو والوں کے ہزار دو ہزار ورق دواوینِ فارسی کے کُتب خانے کے کُتب خانے پر کیوں کر غالب

؎ ہم تجھ سے اسی روز کو روتے تھے نظیر، آہ! کیوں تو نے پڑھا عشق و محبت کا رسالہ؟

آسکتے تھے۔ حُبِّ وطن، جدت پسندی، اور تفنن کی وجہ سے گو اُردو کے اُستادوں کا کلام بھی لوگ دیکھتے تھے لیکن شیراز کی خُلّر[۱] کے آگے ہندوستان کے ٹھرّے[۲] کا رنگ کب جم سکتا تھا۔ نظیر کی مُزاولت میں اُس زمانے میں زیادہ تر اِس قسم کی کتابیں رہتی تھیں۔ خمسۂ نظامی۔ خمسۂ جامی۔ خمسۂ خسرو۔ دیوانِ حافظ۔ دیوانِ وحشی۔ دیوانِ خسرو۔ نل دمن۔ دیوان نورالعین واقف۔ دیوانِ نظیری۔ دیوان بیدل۔ دیوانِ ہلالی۔ دیوانِ سعدی دیوان صائب۔ دیوانِ ناصر علی۔ کُلیاتِ نعمت خان عالی۔ دیوان انوری۔ ظفرنامۂ ہاتفی۔ لیلیٰ مجنوں ہاتفی۔ وغیرہ وغیرہ۔

کبھی کبھی وہ تفنناً اُردو کے شُعرا کا کلام بھی دیکھ لیتا تھا۔ جو اشعار یا غزلیں اُس کو پسند آتی تھیں اُن کو زبانی کر لیتا تھا اور اکثر بزمِ احباب میں اُن کی مدد سے حُسنِ بیان کو چمکاتا اور اپنے دلی خیالات کو پُر زور طور سے بیان کرتا تھا۔ دیوانوں میں چوں کہ اکثر ایک ہی مضمون کی بار بار تکرار ہوتی ہے۔ کہیں سیکڑوں ورق اُلٹنے کے بعد کوئی نیا مضمون یا نیا خیال دکھائی دیتا ہے اس لیے دیوان کا دیکھنا کوئی بہت دل چسپ کام نہیں ہے دو چار دیوانوں کے دیکھنے کے بعد طبیعت تکرارِ مضامیں سے گھبرانے لگتی ہے اور آخر تفنن پیدا کرنے کے لیے کسی اور شاخِ ادب کی طرف جُھکنا پڑتا ہے۔ مثنویوں میں گو دواوین کی طرح ایذا رساں تکرار نہیں۔ لیکن غور کرو تو وہ بھی ڈھلی ہوئی سب ایک ہی سانچے کی ہیں۔ مضامین گو کتنے ہی مُختلف ہوں مگر کنیڈا سب کا ایک ہی ہے۔ وہی حمد، وہی نعت، وہی سراپا۔ وہی فراق۔ وہی عاشق کے مصائب۔ وہی مُصیبت کے بعد وصال۔ ہر مثنوی میں اُنھی مضامین کو تھوڑے تفاوت سے کون ذہین اور طبّاع آدمی لذّت اور خوشی کے

---

[۱] شیراز میں خلّر ایک قریہ ہے۔ وہاں کی شراب بہت عمدہ ہوتی ہے۔ قاآنی نے اپنے قصائد میں اس شراب کا اکثر ذکر کیا ہے۔

[۲] ٹھرّا۔ دیسی اور خراب شراب۔ کم نشے کی گھٹیا اور سستی شراب جسے چمار خاکروب وغیرہ پیتے ہیں۔

ساتھ دیکھ سکتا ہی! - پھر مزہ یہ کہ ایک ہی قصّے کو مختلف اساتذہ نے قلم بند کیا ہی - گو ہر ایک کے بیان میں اُس کی خصوصیتِ خیالی کی وجہ سے کوئی خاص لُطف ہو لیکن مضامین میں کوئی خاص جدت یا اضافہ نہیں - چچوڑی ہڈیوں کو نمک مرچ لگا کر تکرار کون چچوڑ سکتا ہی - خلاصہ یہ کہ مثنویاں بھی دس بیس کے بعد اجیرن ہو جاتی ہیں - انھی اسباب سے نظیر کی اسٹڈی[1] میں کبھی کبھی بڑی بڑی قصّے کی کتابیں بھی کھلتی تھیں - وہ عمرو عیار کی عیاریوں کو ضرب المثل کے طور پر سُنتا تھا - امیر حمزہ کی داستان کا ہاتھ آنا کوئی مشکل امر نہ تھا - کسی دن وہ اس کتاب کو لے آیا ہی - شوق کے ہاتھوں سے کھولتا ہی - تفریح کی نگاہ سے دیکھتا ہی - کبھی اظہارِ حیرت کرتا ہی - کبھی متاسف ہوتا ہی - کہیں مُسکرانے لگتا ہی - کہیں کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہی - الف لیلہ کی شُہرت سے بھی اُس کے کان بھرے تھے - کہیں سے فارسی نسخہ لے آیا ہی اور عربی خیالی پرستان میں عشق و عاشقی کی ایک وسیع اور پُر بہار اور حیرت انگیز آبادی پاتا ہی - گو بہت سی بستیاں ہیں لیکن ایک دوسرے سے اُن کی سرحد اس طرح ملی ہوئی ہی کہ معلوم ہوتا ہی یہ کُل بستیاں ایک ہی شہر کے مُختلف آباد اور پُر رونق محلّے ہیں - کُتب بینی کے مسافر کو اصلا مکان نہیں ہوتی اور اس آسانی سے اِس بڑی آبادی کے ہر گوشے کی سیر کر لیتا ہی گویا وہ تختِ سلیمان پر سوار تھا - صناع کوس کی پُر منفعت شُہرت اُس کو بوستانِ خیال کی طرف لے جاتی ہی اور خیال کی طلسمات آفرینیاں قوتِ نامیہ اپنے سرسبز گُل بوٹوں کی بہار دکھاتی ہی -

چوں کہ دہلی میں پیدا ہوا ہی جہاں ہر در و دیوار سے آثارِ صنادیدِ عجم پیدا ہیں بقولِ عُرفی ؎ از نقش و نگارِ در و دیوار شکستہ * آثار پدید است صنادیدِ عجم را * اُس کو طبعی طور پر سلاطین کے کارناموں کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہی - فیروز شاہ کی لاٹ دیکھتا ہی - کیوں کر نہ پوچھے کہ فیروز شاہ کون تھا؟ - شاہجہاں کی جامع مسجد

[1] وہ کمرہ جو کتب بینی اور مشاغل مطالعہ کے لیے مخصوص ہو -

دیکھتا ہی کیوں کرنہ پوچھے اس کا بانی کون تھا؟ - قطب کی لاٹ - حوضِ شمسی - ہمایوں کا مقبرہ ان میں سے ہر ایک پُکار پُکار کر اُس کو تاریخ کی طرف بلا رہا ہی -

انشاے ابوالفضل - رقعاتِ عالمگیری - وغیرہ نیم تاریخی کتابوں کا تعلق کچھ پیشتر سے اُس کے دل میں آہستہ آہستہ تاریخی دُنیا کا شوق پیدا کر چکا تھا - جوانی میں وہ شوق قوت پکڑ کر اُس کو تاریخی کوچے میں تلاش وتفحص کے پانو سے دوڑاتا ہی - ابوالقاسم فرشتہ سے ملتا ہی - جہانگیر سے ملاقات کرتا ہی اور اُس کی زبان سے اُس کے حالات سُنتا ہی - تیمور سے ہم کلام ہوتا ہی اور اُس کے عجیب و غریب خوابوں اور اُس کے متعلق بزرگانِ دین کی مختلف کرامات اور پیشین گوئیوں پر عش عش کرتا ہی - گو اُن قصے کہانیوں کی طرح یہ کتابیں ہر جگہ چنداں دل چسپ نہیں، لیکن جہاں واقعات معمولی سطح سے بلند ہونے لگتے ہیں تو خیالی آنکھوں کو ایک خاص لطف حاصل ہوتا ہی - گویا بڑے بڑے واقعات اُس خوش نمائی سے چشمِ تخیلہ میں نظر آتے ہیں جیسے مسلسل چوٹیاں خوش نما پہاڑوں کی ہوں جو دور سے اپنا سُرمئی جلوہ دکھاتی ہوں - ہر چند ابتدا میں انقلاباتِ سلطنت سے وہ چنداں عبرت حاصل نہیں کرتا - زیادہ تر وہ عشق و محبت کے قصوں کی تلاش میں رہتا ہی - جہانگیر کے عہد کو اس مقام پر زیادہ شوق سے پڑھتا ہی جہاں اُس کے عشقی تعلقات نور جہاں سے پیدا ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایک رنگین افسانہ ہو جاتے ہیں - علاء الدین کے عہد کو وہ اُس مقام پر زیادہ دل چسپی سے مطالعہ کرتا ہی جہاں وہ چتوڑ گڑھ کی رانی کو اپنے قبضے میں لایا چاہتا ہی - یا جہاں اُس کا بیٹا خضر خاں دول رانی کے ساتھ عشق کی شطرنج کھیلتا ہی اور مشکل مشکل چالیں چلتا ہی - لیکن کچھ نہ کچھ اُس کا دل عبرت سے ضرور متاثر ہوتا ہی؛ چنانچہ وہی تخمِ عبرت آگے چل کر بشاداب کو بلیں نکال لاتے ہیں اور نشو ونما پا کر جاں فزا بہار دکھاتے ہیں :-

گر شاہ سر پہ رکھ کر افسر ہوا، تو پھر کیا؟
اور بحر سلطنت[1] کا گوہر ہوا، تو پھر کیا؟
ماہی، علم، مراتب، پُر زر ہوا، تو پھر کیا؟
نوبت، نشاں، نقارہ در پر ہوا، تو پھر کیا؟
سب ملک سب جہاں کا سرور ہوا، تو پھر کیا؟

گر یار رکھ کے فوج، لشکر کی سلطنت سپاہی
پھیری دہائی اپنی لے ماہ تا بہ ماہی
جب آن کر فنا کی سر پر پڑی تباہی
پھر سر رہا نہ لشکر، نہ تاج بادشاہی
دارا جم و سکندر اکبر ہوا، تو پھر کیا؟

یا ذات میں کہائے نامی، اصیل، ذاتی
جمشید، فر کے پوتے، نوشیرواں کے ناتی
تھے آپ مثلِ دولہا اور فوج تھی براتی
جب چل بسے تو کوئی پھر سنگ تھا نہ ساتی
ملک و مکاں، خزانہ، لشکر ہوا، تو پھر کیا؟

یا راج بنسی[2] ہو کر دنیا میں راج پایا
چتور گڑھ[3]، ستارا[4]، کالنجر[5] آ بنایا
جب توپ نے اجل کی آ مورچہ لگایا
سب اُڑ گئے ہوا پر، کوئی نہ کام آیا
گڑھ، کوٹ، توپ، گولہ، لشکر ہوا، تو پھر کیا؟

ف١ اس مصرعے میں علی گوہر کی طرف ایک مخفی اشارہ ہے۔ علی گوہر شاہ عالم کا نام تھا۔

ف٢ راج بنسی شاہی خاندان کا آدمی، راجہ کے خاندان کا۔ راجپوت قوم کا نام۔

ف٣ چتور گڑھ اودے پور میں ایک مقام ہے۔ یہاں راجپوت راجاؤں کا ایک مشہور خاندان قائم ہوا جو غایت شرافت سے اپنے آپ کو آفتاب نسب خیال کرتا ہے اور سورج بنسی کے لقب سے ملقب ہے۔ اس خاندان کے راجہ اپنے تئیں رام کی اولاد سے جانتے ہیں۔ سب سے پہلے چتور گڑھ کے قلعے پر ماموں نے حملہ کیا مگر اس کا حملہ ناکام رہا۔ علاؤالدین نے حملہ کرکے اس پر فتح حاصل کی۔ اس فتح کے بیسیوں قصے بن گئے ہیں، انھی میں آلا اودل بھی ہے۔ دوسری فتح اکبر نے حاصل کی۔

ف٤ ستارہ وہ جگہ ہے جہاں رام راجا قلعہ جنجی سے بھاگ کر متحصن ہوا تھا مگر اورنگ زیب نے ١٧٠٠ء میں بذاتِ خاص اس کا محاصرہ کرکے چوتھے مہینے میں فتح کر لیا۔ تاریخ فتح ستارہ اپریل ١٧٠٠ء ہے۔

ف٥ کالنجر بوندیل کھنڈ کا ایک نہایت ہی مضبوط قلعہ جس کے محاصرے میں شیر شاہ کی جان گئی۔

کتنے دنوں یہ غل تھا، نواب ہیں، یہ خاص ہیں
یہ ابنِ ہجزاری، یہ عالی خاندان ہیں
جاگیر و مال منصب گو آج ان کے ہاں ہیں
دیکھا تو اک گھڑی میں نہ نام نہ نشاں ہیں

دو دن کا شور، چرچا گھر گھر ہوا، تو پھر کیا؟

کہتا تھا کوئی دیکھو، یہ ہیں امیر[۵۱] خاں جی
اور یہ ہیں خانخاناں، اور یہ ہیں شیر خاں[۵۲] جی
پنجہ اٹھا قضا کا جب آئے شیر خاں جی
پھر کس کے میر خاں جی، کس کے وزیر خاں جی

عمدہ، غنی، تونگر، بازر ہوا، تو پھر کیا؟

کہتا تھا کوئی گھوڑا ہے نامدار خاں کا
یہ پالکی، یہ ہاتھی ہے ذوالفقار خاں[۵۳] کا
آیا قدم اجل کے جب تیس مار خاں[۵۴] کا
خبر بھی کہیں نہ دیکھا پھر شہسوار خاں کا

جھپان[۵۵]، بیگ ڈنبر در پہ ہوا، تو پھر کیا؟

کہتا ہے کوئی ڈیوڑھی ہے خانِ مہرباں کی
یہ باغ یہ حویلی ہے مُحلدار خاں[۵۶] کی
جب راج لے قضا کی کرنی بسولی[۵۷] ٹانکی[۵۸]
اک اینٹ بھی نہ پائی ہرگز کسی مکاں کی

رنگین محل، سنہرا گھر، در ہوا، تو پھر کیا؟

۵۱ امیر خاں محمد شاہ رنگیلے کا مصاحب تھا۔ عمدۃ الملک اس کا خطاب تھا۔ بادشاہ کا بہت ہی منہ چڑھا تھا۔ اس کے سیکڑوں لطائف مشہور ہیں چنانچہ وہ پوت سپوت کپوت والا لطیفہ بھی اسی کا ہے جس میں محمد شاہ کے سوال پر خود بدولت کو توپوت قرار دیا برہان الملک کو سپوت اور اپنے تئیں کپوت۔

۵۲ شیر خاں ایک عالی خاندان افغان تھا۔ ہندوستان کے سلاطین اسلامیہ میں خاندان سور کا قائم کرنے والا یہی ہے۔ ہمایوں کے مقابلے میں لڑا اور مختلف لڑائیوں میں اُس کو شکست دے کر ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا۔ پانچ برس اُس نے نہایت دھوم دھام سے سلطنت کی (از ۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء) چتوڑ فتح کر چکا تھا۔ کالنجر کی فتح کی طیاریاں تھیں کہ قضا کی میگزین نے اُس کے دھوئیں اُڑا دیے۔

۵۳ ذوالفقار خاں اورنگ زیب کا نہایت ہی چست و چالاک اور قابل سپہ سالار تھا۔ ۱۶۹۸ء میں قلعہ جنجی اسی کے ہاتھ سے فتح ہوا۔

۵۴ تیس مار خاں اصل میں وہ آدمی جس اکیلے نے تیس کو مار کر خطاب خانی حاصل کیا ہو۔ ترم خاں۔ ترم باز۔

۵۵ جھپان ایک قسم کی عماری نما پالکی جس کا سرد پہاڑوں پر رواج ہے۔

۵۶ دلی میں مُحلدار خاں کا باغ شہر کے باہر جہاں کہیں واقع ہے جیسا کہ غالب کے ایک فارسی کے رقعے سے ظاہر ہوتا ہے۔

۵۷ بسولی اینٹیں گڑھنے کا اوزار۔ تیشہ معمار۔

۵۸ ٹانکی سنگ تراشوں کے ایک اوزار کا نام۔ رُخانی۔ چھینی۔

کتنوں نے بادشاہی کیا کیا خطاب پایا
جب آن کر فنا نے نام و نشاں مٹایا
مہریں بڑی کھدائیں سکہ بڑا بنایا
وہ نام اور وہ سکہ ڈھونڈا کہیں نہ پایا

دو دن کا مُہر چھاپا در پر ہوا، تو پھر کیا؟

جاگیر میں کسی نے زر ریزِ مُلک پایا
لیکن سندِ اجل کا جب فوج دار آیا
کر بند و بست اپنا نظم و نسق بٹھایا
اک دن میں حکم دخاصل سب ہوگیا پرایا

ہانسی، حصار، ٹھٹھا، بھکر ہوا، تو پھر کیا؟

کہتا تھا کوئی لشکر ہی طرہ باز خاں کا
آیا کٹک[۵۲] اجل کے جب یکہ تاز خاں کا
یہ خیمہ شامیانہ ہی شہنواز خاں[۵۱] کا
سر بھی کہیں نہ پایا پھر سرفراز خاں[۵۳] کا

سردارِ میر بخشی بڑھ کر ہوا تو پھر کیا؟

محض تاریخی خشک دفاتر سے اُکتا کر کبھی کبھی وہ شاعرانہ تاریخی تصانیف کی طرف بھی رُخ کرتا ہی جن میں واقعات کے ضمن میں واقعاتِ عجیبہ اور معارکِ غریبہ کا ایک شاعرانہ دل چسپ پیرایے میں ذکر ہوتا ہی اور جن میں اکثر اوقات واقعاتِ تاریخی سے زیادہ واقعاتِ عشقیہ چمکائے جاتے ہیں اور رزم سے زیادہ بزم رنگین کر کے دکھائی جاتی ہی۔ ممکن نہیں کہ وہ تاریخ اور ادب دونوں کا مذاقِ مشترک رکھ کر جوانی کے پُرجوش زمانے میں شاہنامے کی رنگین اور دل کش داستانوں سے باز رہا ہو۔

[۵۱] شہنواز خاں ناصر جنگ والیِ ریاستِ حیدرآباد کا وزیر یا مدار المہام تھا۔ غلام علی آزاد کا معاصر ہی۔ علمی قابلیت خاصی رکھتا تھا۔ شعر و سخن سے بھی اُس کو ذوق تھا۔ ایک شہنواز خاں عبد الرحیم خانخاناں کا بیٹا بھی تھا۔

[۵۲] کٹک فوج۔

[۵۳] سرفراز خاں شجاع الدین کا بیٹا اور مرشد قلی خاں کا پوتا تھا۔ ۱۷۳۹ء میں باپ کا جانشین ہوا۔ نادر شاہ کا حملہ بھی اسی زمانے میں ہوا تھا۔ جب ہند سے لوٹ مار کر چلا گیا تو علی وردی خاں صوبہ دارِ بہار نے محمد شاہ کے وزیر کو کچھ دے دے کر بنگالے کی صوبہ داری کی سند حاصل کی حصولِ سند کے بعد فوج لے کر مرشد آباد پر چڑھ آیا۔ سرفراز خاں گولی سے مارا گیا۔ علی وردی خاں اُس کی جگہ تخت پر بیٹھا اور خطبہ سکہ جاری کیا اور حسبِ عدہ دہلی کو ایک کرور نقد اور ستر لاکھ کے جواہرات بطور نذر روانہ

کُتب بینی ہو اور جوانی کا زمانہ۔ پھر جوانوں کے مذاق کی نہایت شوخ رنگین کتابیں بعض اوقات تخلیہ میں کُھلیں محض تعجب ہی تعجب ہی۔ ہرچند بطور درس بہارِ دانش کے کچھ اجزا پڑھ گیا ہی لیکن اُس کی تمام حکایتیں ہنوز اُس کی نظر سے نہیں گزریں۔ اور اگر گزری ہیں تو اُن کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔ اب اُس کتاب کو پھر نکالتا ہی اور عورتوں کے چہتر[1] کی حکایتوں کو غور سے پڑھتا ہی۔ رات کا آنا اور دن کا جگمگانا اسی ایک مضمون کو ہر جگہ ایک نئے طور پر پاتا ہی۔ وصال کی حالت کی تعبیر مختلف دلچسپ اور دل آویز کنایوں میں معاینہ کرتا ہی۔ اِن فقرات کو مزہ لے لے کر پڑھتا ہی اور گوہرِ بے بہا سمجھ کر حافظے کے بکس میں محفوظ طور پر رکھ لیتا ہی۔ وہ چہتر کی حکایتوں کو اپنے احباب کی محفل کے گرم کرنے کو یاد رکھتا ہی اور ان کو بعض اوقات موقع سے بیان کرکے اُن کو حیرت میں ڈال دیتا ہی اور کبھی بعض ذہین دوست سے کوئی چہتر کی تازہ نقل بھی سن لیتا ہی اور پھر دیر تک مزے مزے کی باتیں ہوتی ہیں۔ ذکر ہی ذکر میں دوسری اسی قسم کی کتاب کا حال معلوم ہوتا ہی یہ مشتاق ہوتا ہی اور بڑے اصرار سے اُس کی کسی دوست پر فرمایش کرتا ہی۔ اسی طرح آئے دن ایک نہ ایک نئی کتاب رنگین مذاق کی اُس کے ملاحظے میں گزرتی ہی۔ اور رنگین علمِ مجلس کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اُس کے پاس جمع ہو جاتا ہی۔

اِس قسم کی کُتب بینی کا اثر اُس کے کلام کے بعض حصّے پر بہت نُمایاں طور پر پھیلا ہوا ہی۔ وصل۔ تمنا۔ خلاصی۔ آندھی۔ نارنگی۔ بعض ہولی۔ ازاربند۔ رم چیرا اور کالیتھ وغیرہ اِسی قسم کے کلام میں داخل ہیں۔

اِس سے زیادہ ہم نظیر کو اسٹنڈی نیس بند رکھنا پسند نہیں کرتے۔

---

[1] چہتر۔ چلتر فریب کرچال چھل چھل بتا

کتنا ہی شوقِ علم کیوں نہ ہو لیکن اُس سے یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ وہ دن رات ورق گردانی ہی میں مصروف رہے گا۔ کھانے کا وقت آگیا ہی۔ آخر وہ کچھ کھایا بھی چاہے۔ روٹی دال سامنے آتی ہی اور پیٹ میں پڑ کر آنکھیں سی کھول دیتی ہی۔

جب ملی روٹی ہیں سب نعمِ حق روشن ہوئے
زندگی کے تھے جو کچھ نظم و نسق، روشن ہوئے
رات دن شمس و قمر، شام و شفق روشن ہوئے
اپنے بیگانوں کے لازم تھے جو حق، روشن ہوئے

دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہیں چودہ طبق روشن ہوئے

وہ جو اب کھاتے ہیں باقرخانی، کلچہ، شیرمال
یہ جو روٹی دال کا گردن میں ہم رکھتے ہیں جال
ہیں وہ خاص الخاص درگاہِ کریم ذوالجلال
جب ملی روٹی وہیں ہم ہو گئے صاحبِ کمال

دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہیں چودہ طبق روشن ہوئے

روٹی کا اب ازل سے ہمارا تو ہی خمیر
یا پتلی ہووے موٹی، خمیری ہو یا فطیر
رُوکھی ہی روٹی حق میں ہمارے ہی شہد و شیر
گیہوں، جُوار، باجرے کی جیسی ہو، نظیر

ہم کو تو سب طرح کی خوش آتی ہیں روٹیاں

خوابِ نیم روز سے وہ ہوشیار ہوا ہی۔ منھ ہاتھ دھو کر پھر بارِ ثالث آئینے کنگھی سے ملاقات کر رہا ہی منتظر ہی کہ تمازتِ آفتاب میں کمی آئے تو پوشاک بدل کر سیرِ بازار کو نکلے۔ بہ تدریج دو تین یار آشنا بھی پاس پڑوس سے

آگئے ہیں۔ گپیں چھڑ گئی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بڑے بڑے زور سے ہنسی کی آواز بلند ہوتی ہے۔ لیجیے آفتاب اب مغربی اُفق سے بہت قریب ہے۔ دُھوپ میں زردی آگئی ہے۔ وہ تیزی باقی نہیں رہی۔ شوقین جیوڑے ایک ایک دو دو کرکے اپنے گھر سے بن سنور کر نکل رہے ہیں۔ نظیر بھی بعض ہم مذاق زندہ دل دوستوں کے ساتھ ایک خاص شان سے نکلا ہے۔ گو لباس میں جوانی کے مذاق نے کچھ تکلّف کیا ہے مگر اس تکلّف میں بھی ایک سادگی ہے۔ سڑک پر جا رہا ہے کہ ایک طرف سے ایک نالکی چلی آرہی ہے۔ ہٹو، بڑھو، کی آواز بلند ہے۔ کوئی امیر بڑی شان سے اُس کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ نوکر صُراحی حقّہ لیے جلو میں دوڑے آتے ہیں۔ امیر صاحب کے مُغنی قوی اور نالکی کی ہیئت کذائی پر اُس کو نعمت خانِ عالی کی وہ مشہور پھبتی یاد آتی ہے۔ دوستوں کا خیال وہ اُس نقل کی طرف پھیرتا ہے۔ اور آپ بھی ہنستا ہے اور اُن کو بھی ہنساتا ہے۔ جوہری بازار سے اُس کا گزر ہوتا ہے۔ وہاں بڑے بڑے مہاجن اور سیٹھ اپنی اپنی دُکانوں میں بیٹھے بہی کھاتا پھیلائے ہوئے ہیں اُن کے چھوٹے چھوٹے بچے گورے گورے ہاتھوں میں سونے کے کڑے، کانوں میں بالی جھمکائے اُن کے پہلو میں بیٹھے اپنے کسی معصومانہ کھیل میں مصروف ہیں۔ یا کسی اپنے ہمجولی کے ساتھ اُچھل کود رہے ہیں۔

کتنے اسی بازار میں زر کے ہی پیشہ دار ہیں	بیٹھے ہیں کر کر کوٹھیاں، زر کے لگے انبار ہیں
سب لوگ کہتے ہیں انھیں یہ سیٹھ ساہوکار ہیں	
ہیں فرش کوٹھی میں بچھے تکیے لگے ہیں زرنشاں	بہیاں کھلی ہیں سامنے، لکھتے ہیں لکھی کاروال
کچھ پیٹھ[1] کچھ پر پیٹھ[2] کی آتی ہیں باتیں درمیاں	لاکھوں کے لکھتے درشنی، سو سیکڑوں کی ہنڈیاں

[1] پیٹھ۔ مثنیٰ۔ نقل۔ گم شدہ ہنڈی کی نقل۔

[2] پر پیٹھ۔ مثنیٰ کی نقل۔ دوسرا مثنیٰ۔ گم شدہ ہنڈی کی تیسری نقل۔ تیسرا رونہ۔

کیا کیا متی اور سود کی کرتے سدا تکرار ہیں

کچھ مول کا منکو رہی کچھ بیاج[۵۱] کا ہی کھٹکا
پھیلاؤ میں تیرج[۵۲] کی بیجک[۵۳] کا چرچا ہو رہا
دلال ہنڈی پیٹھ سے، با مہن پرکھے سدھ سوا
آڑت بھلاتے ہر جگہ، چٹھی لکھانے جا بجا

کچھ رکھنے والے کے پنے، کچھ جوگ[۵۴] کے اقرار ہیں

تھوڑی سی پونجی جن کی ہے بیٹھے ہیں وہ بھی لے کے یاں
اودھر لگے دس بیس کے اودھر دھری ہیں کوڑیاں
اور جو ہیں حد ٹٹ پونجیے، وہ کوڑیوں کی تھیلیاں
کا ندھوں پہ رکھ جاتے ہیں واں لگتی جہاں ہیں گدڑیاں

دیکھا تو یہ سب پیٹ کے دھندے ہیں اور بستار[۵۵] ہیں

اسی بازار میں ایک طرف سے ایک نہایت بانکے ترچھے سپاہی بل دار چیرہ باندھے، اور اس پر طرہ جھمکائے ہوئے ایک بانکے کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ دونوں زمین پر اس غرور کے ساتھ قدم رکھتے ہیں جیسے رستم کے پوتے ہوں۔ ایک ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ رہا ہے تو دوسرا القا کبوتر بنا ہوا ہے۔ زمین کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ بانکے صاحب الگ مونچھوں کو تاؤ دے رہے ہیں سپاہی صاحب الگ ڈاڑھی کو چڑھا رہے ہیں۔ وہ اگر خانہ جنگی لڑ کر بدن میں ٹانکے کھانے کا ذکر کر کے دور کی ڈینگ ہانکتا ہے، تو یہ کھیتوں میں جا کودنے اور لاکھوں کے تئیں بھگانے اور پھر بے داغ نکل آنے کا تذکرہ کر کے تعلّی کی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہے۔

۵۱ بیاج وہ اضافہ جو ایک جنس کے بدلے میں اسی جنس سے لیا جائے جیسے روپے کے بدلے روپیہ پیسے کے بدلے پیسہ۔ گیہوں کے بدلے گیہوں کا زیادتی کے ساتھ مبادلہ ہو۔ مسلمان اس کو بیاز بولتے ہیں۔
۵۲ تیرج ایک مطول اور مفصل فرد حساب کا خلاصہ۔
۵۳ بیجک وہ کاغذ جس میں مال کی تعداد خرچہ قیمت خرید اور تفصیل درج ہو۔ روانہ شدہ مال کی فہرست یا فرد۔
۵۴ جوگ = وہ شخص جس کے نام ہنڈی کی جائے۔
۵۵ بستار = پھیلاؤ۔ وسعت فراخی۔ کشادگی۔ طول کلامی۔ تفصیل۔ تشریح (عورتیں باضم بولتی ہیں) پھیلاوٹ۔ تقسیم عمل بانٹ۔ حساب کا عمل یا حل۔

نظیر ان کی لمبی چوڑی باتیں سُن کر مسکراتا ہے۔ چلتے چلتے وہ آخر ایک ایسے مقام میں پہنچا ہے جہاں ور وبہ ہر درجے اور مرتبے کی قمریاں اپنی اپنی کابکوں میں بیٹھی لوگوں کو اپنی اداؤں سے رجھا رہی ہیں۔ کسی کا کوئی معزز آشنا سامنے سے گھوڑا کُدا کر نکل گیا۔ کسی کا کوئی دل لگی کا یار اکڑبل دکھا کر چلا گیا۔ جانے پہچانے لوگوں سے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہو رہی ہیں۔ کسی بڑھیا نائکہ نے وسعتِ اخلاق سے کسی پرانے ملاقاتی کو چھجتے کے نیچے پکار کر ٹھہرالیا ہے۔ مزاج پوچھ رہی ہیں۔ اُن کے مدتوں سے نہ آنے کی شکایت فرما رہی ہیں۔ "آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔ دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ ہم غریبوں کے ہاں کیوں آنے لگے"۔ بڑے میاں معذرت کرتے جاتے ہیں۔ "تردداتِ دنیاوی کا ایک دفتر کھُل گیا ہے۔ لڑکا بیمار تھا۔ خدا کے گھر سے پھرا ہے۔ بھائی پر ایک مقدمہ دائر ہو گیا تھا۔ مہینوں میں اُس سے نجات ہوئی۔ خود مَیں مسہلوں کے عذاب میں تھا۔ جب سے وہ مرضِ مُبارک ہوا چیت کے چیت مُسہل لینا پڑتا ہے۔ نہ لُوں تو تمام بدن پھوڑے پھُنسیوں سے بھر جائے۔ ایک عذاب میں ہوں"۔ ایک دوسرے کوٹھے پر ایک دوسرا سین ہے۔ چند نوجوان چھوکریاں جمع ہیں۔ ایک ایک اُن میں کی آفتِ روزگار ہے۔ اِن کے بیچ میں ایک مضحک صُورت کے پُرانے بوالہوس بیٹھے ہوئے ہیں۔ زمانۂ جوانی میں اُنھوں نے بہت عیش کیا ہے اور اپنی دولت بھی اسی عیش میں پھونک ڈالی ہے۔ بڑھاپے میں نہ عیش کی قوت ہے نہ سامان۔ مگر چسکا پڑا ہوا ہے۔

بوڑھے ہوئے، پر حُسن کی چاہت نہیں چھٹتی	اور دل سے بھی محبوب کی اُلفت نہیں چھٹتی
آنکھوں سے یہ دیدار کی لذت نہیں چھٹتی	سب چھُٹ گیا پر دید کی یہ لت نہیں چھٹتی

بے ویسی صحبت کے جی کیوں لگنے لگا۔ معمول بموجب آ گئے ہیں۔ چھوکریوں کو ایک خاصہ مضحکہ ہاتھ آیا ہے۔

منھ دیکھتے ہی کہتی ہیں سب آؤ بڑے جی
کیا آئے ہو یاں کرنے کو پیری و مریدی؟
کیا آئے ہو حضرت ہمیں قرآن پڑھانے
ہنس ہنس کوئی پوچھے ہے نمازوں کے دوگانے
ٹھٹھے سے کوئی پھینکے ہے تسبیح کے دانے

کھینچے ہے کوئی ہاتھ، کوئی پکڑے ہے لکڑی
ٹٹے کہیں، اور موچھیں کہیں جاتی ہیں پکڑی
ڈارھی کو پکڑ کھینچ کوئی جھاڑے ہے مکڑی

نقلیں کوئی اُن پوپلے ہونٹوں کی بناوے
چل کر کوئی کبڑے کی طرح قد کو جھکاوے
ڈارھی کے کنے اُنگلی کو لا لا کے نچاوے

نظیر اُس بازار سے گزرتا ہے جہاں خربزے اور چھالیوں کا انبار لگ رہا ہے۔ آموں کا ڈھیر ہے۔ ہندوؤں کی عورتیں بڑے گھیر کا لہنگا۔ چولی پہنے۔ دُلھن کی طرح گھونگھٹ نکالے، ایک خاص ادا سے چھم چھم کرتی ہوئی خریداری کے لیے آجا رہی ہیں۔ اُن میں بعض کی حسین کلائی اُس کے دل میں شوق کی گدگدی پیدا کرتی ہے۔ خمار آلودہ آنکھوں کی گھونگھٹ کے اندر سے ترچھی آڑی نگاہیں تیرِ نیم کش بن کر جگر کے پار ہوتی ہیں۔ نظیر گو اُن سے نہیں کہتا مگر دل ہی دل میں سو دفترِ شوق لکھ جاتا ہے۔ اور بار بار اُس کی طبیعت کے پُر جوش بحر میں یہ شعر عالمِ حُسن طلب میں موزوں ہوتا ہے:۔

اک دم کو آگئے ہیں منھ مت چھپائیے ہم سے
ٹُک ہنس کے اوپری رو آنکھیں لڑائیے ہم سے

بازار میں ایک گوشے میں گاہکوں کا بہت ہجوم ہے۔ کوئی رنگیلی کنجڑن چٹکیلی پوشاک پہنے نارنگیوں کا بیوپار کر رہی ہے۔ نارنگیوں سے زیادہ لوگ اُس کی نارنجی پوشاک اور رسیلی آنکھوں پر لٹو ہیں۔ وہ شوخ بھی

اپنی آنکھوں کی ترازو میں نہایت پھرتی سے لوگوں کے شوق کو تول رہی ہے۔ ہر کو اُس کے اشتیاق کے مطابق نارنگی دکھاتی ہے۔ کبھی بے ساختگی سے آنچل ڈھلک جاتا ہے۔ کبھی کسی چیز کے اُٹھاتے وقت آپ سے انگیا چڑھ جاتی ہے۔

سامنے اپنے وہ بازار سنا کو لوں کا لگا		دم بدم چھیڑ سے کہتی ہے یہ انگیا کو دکھا:	
"تم نے پیسے کی کبھی ہم سے نہ لی نارنگی"			

روز کی ہواخوری اور سیرِ بازار نے نظیر کی معلوماتِ حُسن و عشق میں ایک خاص وسعت پیدا کی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ حُسن کی کہربائیت کم و بیش ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے اور تھوڑی بہت اس کی نکیلی چوٹ ہر دل کو لگتی ہے۔ وہ کبھی کبھی جھونپڑوں سے بعض ایسی صورت کو جھانکتے دیکھتا تھا جس سے نوابوں اور امیرزادوں کے دلوں میں ہل چل مچ جاسکتی تھی۔ وہ بعض اوقات سُنتا تھا کہ بعض بیگمات جھروکے سے جھانکتے جھانکتے کسی کی اُلفت کی جھونک میں کسی جھونپڑے میں جا براجیں۔ باپ کالے کوسوں اپنی نوکری کے جھگڑوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ ماں پردے کی بیوی اُس کو باہر کی کیا خبر۔ میاں نظیر پر جوانی کی آفت سوار۔ ایک پلٹن نوجوان دوستوں کی ہر وقت زیرِ کماں۔ دن رات شہرِ عیش و تفریح پر دھاوے رہتے تھے۔ آدمی شب و روز میدانِ کارزار میں رہے اور بال بال محفوظ رہے۔ کبھی کوئی چرکا نہ کھائے۔ کوئی گولی ذرا پہلو سے چھلتی ہوئی بھی نہ نکل جائے، ممکن نہیں۔ نظیر کا دل بھی عشق کی چوٹ سے محفوظ نہیں رہا۔ اُس نے اپنی سیر میں ایک نہیں بیسیوں دفعہ بعض ایسی صورت دیکھی جس کو دیکھ کر وہ تلملا تلملا کر رہ گیا ہے۔ لیکن چوں کہ قلب پر قابو رکھتا تھا، اور مضبوط اُصول اور مضبوط ارادے کا آدمی تھا اُس نے عنانِ اختیار ہاتھ سے نہیں دی۔ مگر آخر ضبط کی کوئی انتہا بھی ہے۔ ایک جگہ فقط آنکھیں متوالی تھیں۔ دوسری جگہ اس متوالی کے پاس بھنووں کی کھچی ہوئی کمانیں، اور پلکوں کے

سڈول اور لمبے نکیلے تیر بھی تھے۔ تیسری جگہ زلفوں کی لمبی کمند بھی لٹک رہی تھی۔ چوتھی جگہ وار روکنے کو دو قیامت کی ڈھالیں بھی تھیں۔ وہ کون سُورما ہی جو اتنے ہتھیار دیکھ کر بھی ہتھیار نہ رکھ دے۔ نظیر کے بھی آخر پاے ثبات لڑکھڑائے۔ بے اختیاریِ شوق میں ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے بعض خاص محرمِ راز کو بُلایا ہی۔ اُن سے تخلیے میں وہ رُک رُک کر اپنے عشقی حالات بیان کر رہا ہی۔ اقرار کرتا ہی کہ اب ضبط کی طاقت نہیں۔ پوچھتا ہی کہ ملاقات کی کیا شکل ہ؟ محرم اُس کو تسکین دیتا ہی۔ کچھ تدبیریں پیش کرتا ہی۔ نظیر ناآزمودہ کاری کی وجہ سے اُن کے قبول کرنے سے ہچکچاتا ہی۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے کوچۂ دلدار کی طرف رُخ کرتا ہی۔ وہ دوست جو کسی قدر تجربہ کار ہی ساتھ ہوتا ہی۔ دہنے بائیں دیکھ کر کھڑکی میں در آتا ہی۔ دل کی دھڑک کے ساتھ سیڑھیوں کو طی کر کے اوپر پہنچتا ہی۔ جھیپتا ہوا لبِ فرش تک جاتا ہی۔ گھبراہٹ میں جوتی پاؤں کی اُترتے ہی منتشر ہو جاتی ہی۔ اُس شاہدِ نظیر فریب کو خبر ہوتی ہی۔ سونا رسے سر نہوڑائے گردن جھکائے آتی ہی۔ عجب ادا سے بندگی کرتی ہی۔ نظیر تھراتی ہوئی آواز سے جواب دیتا ہی۔ جھکے ہوے چہرے کے ساتھ مزاج پوچھتا ہی۔ خود شوق کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ دوست اُس کی زبان بنتا ہی۔ تبسم کے ساتھ کچھ دبی زبان سے کلماتِ انکسار بیان ہوتے ہیں "میں کس لائق ہوں۔ آپ لوگ بھنوں کے جھروکے سے دیکھتے ہیں"۔ شکریہ ادا ہوتا ہی "میری بڑی خوش قسمتی ہی کہ آپ غریب خانے پر تشریف لائے"۔ حقے کی دعوت ہوتی ہی۔ چلتے وقت عطر اور پان دیا جاتا ہی۔ عاشق کچھ پیش کش کرنا چاہتا ہی۔ قبول نہیں ہوتا۔ وعدہ لیا جاتا ہی کہ "پھر تشریف لائیے گا۔ بھول نہ جائیے گا"۔ مکتبِ عشق میں یہ نظیر کی بسم اللہ تھی۔ چوں کہ ذہین تھا اور فنِ عشق سے ازلی مناسبت لے کر آیا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس فن میں بھی ایسی ترقی کی کہ بڑے بڑے اُستاد اس کا لوہا ماننے لگے۔ شاہدوں میں اُس کی بڑی قدر تھی۔ اُن کے نکاتِ حُسن اس نے جیسے

کھلنے تھے مشکل ہی کہ دوسروں پر کھلیں۔ ہر ایک نکتے کی پہنچ کر داد دیتا تھا اور کان کے رستے سے اُن کے دلوں میں سما جاتا تھا۔ پھر شعر و سخن کی چاٹ الگ تھی۔ ظرافت کی چاشنی جُدا۔ اس کے آتے ہی حسین چہروں پہ مارے شگفتگی کے تازہ گلاب کھل جاتے تھے۔ گُل کی طرح جاموں میں پھولی نہیں سماتی تھیں۔

میں نے بڑی تلاش سے نظیر کی ایک معشوقہ کا پتا لگایا ہے۔ نام اس کا موتی ہے۔ گو نظیر نے صاف اُس کی رنگت نہیں بتائی۔ اُس کا قد و قامت نہیں دکھایا۔ لیکن اُس کا کوئی بناؤ اس نے ہم سے نہیں چھپایا۔ وہ ہنستی ہے تو روکتا نہیں۔ باتیں کرتی ہے تو ٹوکتا نہیں۔ پان کھاتی ہے تو کھانے دیتا ہے۔ مسی لگاتی ہے تو لگانے دیتا ہے۔ گلا کھول کھول کر دکھاتا ہے کہ موتیا کے ہار کس قدر زیب دیتے ہیں۔ بازو اور کلائی کھول کھول کر دکھاتا ہے کہ بازو بند اور گجرے کس قدر موزوں ہیں۔ ایک ایک زیور کا حسن دکھاتا ہے اور داد لیتا ہے۔ زیوروں کی خوشنما جھنکار اور زمزمہ سُنانے کو وہ اُس شاہدِ رعنا کو ناز سے دو چار قدم چلنے کی بھی اجازت دیتا ہے۔ چہرے پر پسینے کی بوندوں کی بہار دکھانے کو کبھی وہ اُس سے بال بال میں موتی بھی گندھواتا ہے۔ اور کسی معشوقہ سے قطع نظر کی جائے تو کی جائے مگر اس سے قطعِ نظر ممکن نہیں۔ نظیر نے اُس کی تصویر یوں کھینچی ہے:۔

رہے ہیں اب تو پاس اُس شوخ کے شام و سحر موتی	جبیں پر موتی، اور سر میں ہیں موتی، مانگ پر موتی
اِدھر جگنو، اُدھر کچھ بالیوں میں جلوہ گر موتی	بھرے ہیں اُس پری میں اب تو یارو سر بسر موتی

گلے میں، کان میں، نتھ میں، جدھر دیکھو اُدھر موتی

کوئی اس چاند سے ماتھے کے ٹیکے میں اُچھلتا ہے	کوئی بندوں سے مل کر کان کے نرموں میں ہلتا ہے
لپٹ کر ڈھلک ڈھلکی میں کوئی سینے پر مچلتا ہے	کوئی جھمکوں میں جھوے ہے کوئی بالی میں ہلتا ہے[١٥]

١٥ قدما نے اپنا قبح ابھی باندھا ہے۔ چنانچہ میر نے اپنے شکار نامے میں لکھا ہے:۔ ع لگی گولی پڑنے، نہ پھر چل سکا ٭ نہ جا گہ سے اُکسا، نہ ٹک ہل سکا ٭ ؎ ع گئے کیوں گردن ہلاں ابھی سے ڈھلک چلی ٭ ابرو تو اک طرف پلک اس کی نہیں ہلی ٭ سودا ع ممکن ہے تیر خوردہ تڑپ کر سنبھل سکے ٭ مارا تری نگہ کا جگہ سے نہ ہل سکے ٭

یہ کچھ لذت ہے جب اپنا چھداتے ہیں جگر موتی

کبھی وہ نازنیں ہنس کر جو کچھ باتیں بناتی ہے — تو اک اک بات میں موتی کو پانی میں بہاتی ہے
ادا و ناز میں چنچل عجب عالم دکھاتی ہے — وہ سمرن موتیوں کی انگلیوں میں جب پھراتی ہے

تو صدقے اس کے ہوتے ہیں پڑے ہر پور پر موتی

غلط ہے اس لب رنگیں کو برگ گل سے کیا نسبت — کہ جن کی ہے عقیق اور تپے اور یاقوت کو حسرت
ادا ہٹ کچھ مسی کی، اور اس پر پان کی رنگت — وہ ہنستے ہیں تو کھلتا ہے جواہر خانۂ قدرت

ادھر لعل اور ادھر نیلم، ادھر مرجاں ادھر موتی

کبھی جو بال اپنے میں وہ موتی پروتی ہے — نزاکت سے عرق کی بوند بھی مکھڑے کو دھوتی ہے
بدن بھی موتی، اور سراپوں سے پہنے بھی موتی ہے — سراپا موتیوں کا پھر تو اک گچھا وہ ہوتی ہے

کہ کچھ وہ خشک موتی، کچھ پسینے کے وہ تر موتی

گلے میں اس کے جس دم موتیا کے ہار ہوتے ہیں — چمن کے گل سب اس کے وصف میں موتی پروتے ہیں
نہ تنہا رشک سے قطرات شبنم دل میں روتے ہیں — فلک پر دیکھ کر تارے بھی اپنا ہوش کھوتے ہیں

پہن کر جس گھڑی بیٹھے ہے وہ رشک قمر موتی

وہ زیور موتیوں کا، واہ! اور کچھ تن وہ موتی سا — پھر اس پر موتیا کے ہار، بازوبند اور گجرا
سراپا زیب و زینت میں وہ عالم دیکھ کر اس کا — جو کہتا ہوں "ارے ظالم، ٹک اپنا نام تو بتلا"

تو ہنس کر مجھ سے یوں کہتی ہے وہ جادو نظر "موتی"

کڑے، پازیب، توڑے[لہ] جس گھڑی آپس میں لڑتے ہیں
تو ہر جھنکار میں کس کس طرح باہم جھگڑتے ہیں
کسی دل سے بگڑتے ہیں، کسی کے جی پہ اڑتے ہیں
کڑے سونے کے کیا، موتی بھی اُس کے پانو پڑتے ہیں
اگر باور نہ ہو دیکھو ہیں اُس کے کفش پر موتی

تھا ہوا اِن دنوں کچھ روٹھ بیٹھی ہے جو ہم سے وہ
تو اُس کے غم میں جو ہم پر گزرتا ہے سو مت پوچھو
چلے آتے ہیں آنسو، دل پڑا ہے جگر میں غش ہو
وہ دریا موتیوں کا ہم سے روٹھا ہو تو پھر پیارے
بھلا کیوں کر نہ برساوے ہماری چشمِ تر موتی

شفق میں اتفاقاً جیسے سورج ڈوب کر نکلے
دیا ابرِ گلابی میں کہیں بجلی چمک جاوے
بیاں ہو کس طرح سے آہ! اُس عالم کو کیا کہیے
تبسم کی جھلک میں یوں جھمک جاتے ہیں دانت اُس کے
کسی کے یک بیک جس طور جاتے ہیں بکھر موتی

ہمیں کیوں کر پری زادوں سے بوسوں کے نہ ہوں لہنے
جڑاؤ موتیوں کے اس غزل پر واریے گہنے
سخن کی کچھ جو اُس کے دل میں ہے اُلفت لگی رہنے
نظیرؔ اِس ریختے کو سن وہ ہنس کر یوں لگی کہنے:
"اگر ہوتے تو میں دیتی تجھے اک تھال بھر موتی"

اِس کا تجویز کرنا مشکل ہے کہ گو یہ شخص کاجل کی کوٹھری میں لباسِ دامن دار پہن کر مدتوں جایا کیا مگر ساتھ اس کے اُس کا دامن، اُس کی آستین دھبوں سے پاک رہی۔ خود اُس کے زمانے میں لوگوں کی اُس کی نسبت مختلف رائیں تھیں۔ بُرے لوگ جن سے زمانہ بھرا پڑا ہے اُس کو یقیناً ایک چھٹا ہوا شہدا جانتے تھے۔ اُس کے شاہدانِ بازاری کے ہاں زیادہ آنے جانے کی تاویل سوا اس کے اُن کے ذہن میں کوئی تھی ہی نہیں کہ وہ اُن سے

لہ توڑا زنجیرِ گلو خواہ پا جو بطورِ زیور اکثر عورتیں پہنا کرتی ہیں۔

ناپاک تعلقات رکھتا تھا۔ لیکن جن کو اُس کے ساتھ خصوصیت تھی، اُس کے دن رات کے جلیس تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ وہ ایک خاص حد سے زیادہ کسی شوخ رنگیں ادا سے مخالطت نہیں کرتا۔ اُن کو تعجب بھی ہوتا تھا کہ باوجود طرفِ ثانی کے التفاتِ زائد کے یہ سبقتِ زائد کیوں نہیں کرتا۔ بعض دفعہ اِس کی خوش قسمتی پر رشک کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "تم پر عورتیں مرتی ہیں اور تم کو کچھ التفات نہیں۔ کاش ہم کو یہ موقع ملتا تو پھر تم دیکھتے کہ کیا بہار ہوتی" وہ اِس قسم کی باتوں پر مُسکرا دیتا۔ احباب اُس کے دیکھتے تھے کہ بعض دل رباؤں کے ساتھ اُس کو خاص شیفتگی ہے۔ اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کو وہ حد سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ اُن کی صحبت میں ہر موقع فرصت پر بیٹھا ملتا ہے۔ تخلیے کی صُحبتیں بھی اُن سے رہتی ہیں۔ اختلاط کی پینگیں بھی بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ یہ چٹّی کر رہا ہے۔ اُنگلیاں چٹخا رہا ہے۔ سر میں تیل ڈال رہا ہے۔ تلوا سہلا رہا ہے۔ ہتیلی کو نرم نرم اُنگلیوں سے دبا رہا ہے۔ مگر کسی موقعِ عام پر اُن کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں نہیں جھپکتیں۔ وہ ہر ایک موقع پر اُن سے آنکھ میں آنکھ ڈال کر نہایت کشادہ پیشانی سے باتیں کر سکتا ہے۔ تاڑنے والے اپنے فن کے قواعد کی رو سے اُس کو عشقی محکمے میں مُجرم قرار دے نہیں سکتے، گو بدگمانی کبھی کبھی یوں ہی کچھ کانوں میں پھونک دیتی ہے۔

نظیر کے بعض رندانہ کلام سے لوگ ایسا استنباط کر سکتے ہیں کہ وہ شاید عشق کی انتہائی ذلیل اور ناپاک حالت تک پہنچا ہو۔ چنانچہ اُس کی اُس غزل کے پڑھنے پر جس کا مطلع یہ ہے:-

دیکھ کر کُرتی سگلے میں سبز دھانی آپ کی	دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی

تھوڑی دیر کے لیے مجھ کو بھی ایسا شبہہ پیدا ہوا تھا۔ غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل نظیر نے کسی دوست کی فرمایش سے عالمِ جوانی میں لکھی تھی۔ اُس دوست کو کسی رنگیں لباس شاہدِ بازاری سے کسی خاص زمانے میں تعلق تھا اور تعلق انتہائے بے تکلفی کو پہنچ کر بعض مبارک امراض کا بھی مُوجب ہوا تھا

مزاج تو ان کافروں کے نہایت نازک ہوتے ہیں۔ کسی دن کسی چیز کی فرمایش کی۔ وہ چیز تو بھیجی گئی مگر جس عورت کے ہاتھ بھیجی گئی وہ کوئی بہایت چالاک اور عیار ماتھی، رستے میں کھا گئی، اور وہاں جاکر کچھ جھوٹ سچ بات بنادی۔ تحقیق کی فرصت کس کو، اور ہو بھی تو اتنی تاب کہاں۔ بگڑکر فوراً منع کردیا کہ "فلاں شخص ہماری ڈیوڑھی میں قدم رکھنے نہ پائے۔ ورنہ ہم سے کوئی بُرا نہیں"۔ نظیر کے ہاں دوڑے ہوئے پہنچے "یار غضب ہوا۔ وہ کتنی تحفہ لینے آئی تھی۔ وعدہ کرکے آؤں اور نہ بھیجوں، یہ کیونکر ہوسکتا تھا۔ مگر نہیں معلوم اُس کم بخت نے کیا کیا کہ اُن کو نہیں ملا۔ اب وہ بگڑی ہوئی ہیں۔ کوئی تدبیر ایسی کرو کہ اُن کی رنجش مٹے"۔ نظیر نے قلم اُٹھایا اور فوراً ایک شوخ غزل لکھ دی۔ نظیر کے تخلص نے اثر مطلوب کی ضمانت کی۔

ممکن ہے کہ اس غزل کو خود نظیر کے سر مڑھا جائے، لیکن انسان کی فطرت کے خلاف ہے کہ اپنے عیوب کو اس اعلان کے ساتھ بیان کرے۔ اگر کسی شخص کو کوئی مرض ہو بھی تو اس آزادی کے ساتھ اُس کو بیان نہیں کرسکتا۔

اور تو کیا ہے مگر ہلکے سے اک سوزاک کی	ہے ہمارے پاس بھی اب تک نشانی آپ کی

علاوہ بریں ہم اُس کے تمام کلام میں ایک خاص اخلاقی اثر پاتے ہیں جو صاف بتاتا ہے کہ وہ ایک پاک اور صاف اور گہرے سرچشمے سے آیا ہے۔ ہزلیات میں گو اُس کے رندوں کا گہرا تجربہ شامل ہے لیکن اُس کے اور اخلاقی خیالات کی قوت اور گہرائی اِس امر کا تصور بھی نہیں کرنے دیتی کہ وہ تجربے اُس کے ذاتی ہیں۔

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ	ہے زمیں اُن کی اور اُن کا آسماں سب سے الگ
پاک ہیں آلایشوں سے، بندشوں میں بے لگاو	رہتے ہیں دُنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

وہ بزمِ عیش میں ایک مقام پر لکھتا ہے کہ "ایک دل فریب شوخ میرے ہاں آئی۔ میں نے اُس کی طرف

خطاب کر کے یہ شعر پڑھا:

کرم کردن با حوالِ غریباں		ز دل داراں ز دل داری تواں گفت	

تھوڑی دیر کے بعد وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اُس کی آستین پکڑی۔ اُس نے کہا "اب میرا ٹھہرنے کو جی نہیں چاہتا۔" میں نے کہا "میرا تو جی چاہتا ہے۔" اُس نے کہا "اگر تمھارا یہ جی چاہے کہ بوسہ لوں۔" میں نے کہا "میں تو پارسا ہوں۔" اُس نے کہا "اگر تم رند ہو جاؤ۔" میں نے کہا "ابھی تک تو ہوا نہیں۔ آیندہ کی خدا جانے۔" اُس نے کہا "تمھاری نظر سے تو رندی اب بہت قریب ہے۔" وہ تو چلی گئی مگر میں اس خیال پر بہت دنوں تک ہنستا رہا۔

نظیر کی میلے ٹھیلوں میں شرکت

نظیر جس مزاج کا آدمی تھا وہ کبھی اپنے آپ کو میلے ٹھیلوں سے الگ رکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ انسانی حالات اور خیالات سے حکمت اور عقل حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ انسانی تھیئٹر کا ایک دور اندیش اور صاحب نظر تماشائی تھا۔ وہ ڈراپ سین کے اُٹھنے پر اپنی آنکھیں کسی طرح بند رکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ رغبت اور نفرت رشک اور حسد عشق و محبت کے معاملات سے تفصیلاً واقف ہونا چاہتا تھا۔ بچوں کی معصومانہ خوشی اور اُن کی معصومانہ طلب اور خواہشیں۔ بوڑھوں کی متانت اور سنجیدگی اور قدرتی قناعت۔ عورتوں کا غرورِ حسن اور شوقِ نمایش۔ جوانوں کا اکڑ بل۔ سب اُس کو اپنی طرف مشغول کر لیتے ہیں۔ تیراکی کا میلا ہو۔ کنکوے کا میلا ہو۔ کبوتر بازی کا میلا ہو۔ دوالی ہو۔ ہولی ہو۔ بلدیو جی کا میلا ہو۔ کوئی تقریب ہو کسی طرح کا تیوہار ہو سب میں اس کو جانا۔ اور پوری طرح عاقلانہ لطف اُٹھانا۔

میں دیکھتا ہوں کہ وہ ایک دفعہ خود برج جا کر ہولی کی سیر دیکھ رہا ہے:

یہ سیر ہولی کی ہم نے تو برج میں دیکھی	کہیں نہ ہووے گی اس لطف کی میاں ہولی
کوئی تو ڈوبا ہی دامن سے رے کے تا چولی	کوئی تو مُرلی بجاتا ہے کہ "کنہیا جی"

ہے دھوم دھام یہ بے اختیار ہولی میں

گھروں سے سانوری اور گوریاں نکل چلیاں	کسنبھی اوڑھنی، اور مست، کرتی اچھلیاں

جدھر کو دیکھیں اُدھر مچ رہی ہیں رنگ رلیاں[۵۱] | تمام برج کی پریوں سے بھر رہیں گلیاں
مزا ہی، سیر ہی، در ہر گشت ہر ہولی میں

جو کچھ کھاتی ہی اَبلا[۵۲] بہت پیا یاری | چلی ہی اپنے پیا پاس لے کے پچکاری
گلال دیکھ کے پھر چھاتی کھول دی ساری | پیا کی چھاتی سے لگ گئی وہ چاؤ کی ماری
نہ تاب دل کو رہی، نے قرار، ہولی میں

جو کوئی سیانی ہی اُن میں، تو کوئی ہی نا کند | وہ شور بور تھیں سب رنگ سے نپٹ یک چند | لیکن
کوئی دلاتی ہی ساتھن[۵۳] کو یار کی سوگند | کہ اب تو جامہ و انگیا کے ٹوٹے ہیں سب بند
پھر آ کے کھیلیں گے ہو کر دو چار ہولی میں!

آگرے کی ہولی یوں دیکھتے ہیں:-

ایک لونڈا خوش رو جس کے چہرے پر گلاب کی پتّیاں کھلی ہوئی ہیں، سب سے آگے ہی، اور سیکڑوں لونڈے پیچھے ہیں۔ جتنے ہیں سب کا کپڑا چھڑ کو اں رنگا ہی۔ یہ گل رخوں کا غول آگے ہی۔ منوا بھی ہیں۔ پھر ان کے پیچھے عاشقوں کا غول ہی۔ یہ بھی ہزاروں ہیں۔ عیش و تفریح کے رنگ میں سب ڈوبے ہوئے ہیں۔ خوشی کی بہاریں دکھاتے چلے جا رہے ہیں۔ میاں نظیر بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ پہلے گوکل پورے پہنچے۔ پھر نائی کی منڈی اور سید خاں کی منڈی سے گزرتے ہوئے عالم گنج میں داخل ہوئے۔ وہاں سے شاہ گنج پہنچے۔ پھر تاج گنج آئے

۵۱ رنگ رلیاں کھیل تماشا۔ ہنسی چہل۔ مذاق۔ ٹھٹھا۔ ٹھٹھول۔ عیش و نشاط۔ عیش و عشرت۔ مزہ لطف۔ خوان سے پھر اُن کی رنگیں چمن میں گلیاں دیکھیاں + رنگ محلوں میں جنھوں نے رنگ رلیاں دیکھیاں۔ (ظفر)

۵۲ ابلا۔ شاہد نازک اندام

۵۳ ساتھن ساتھ والی۔ ساتھ کی عورت۔

پھر کناری بازار میں رونق افروز ہوئے۔ وہاں سے موتی کٹڑے آئے۔ پھر پیپل منڈی اور پنی گلی پہنچے غرض تمام شہر کا چکر لگا آئے۔

میاں نظیر فرماتے ہیں کہ "چوک، چارسو جہاں گئے ہر جگہ اس قدر بھیڑ پائی کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اور ہر طرف ایک رنگیں باغ کھلا ہوا ہے"

بلدیو جی کا میلا[۱۵] - جاڑے کے دنوں میں آگرے کے قرب میں ہندوؤں کا یہ میلا بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے۔ جس طرح ہمارے صوبۂ بہار میں چھپتر کا میلا ہے۔ قریب قریب آگرے میں یہ بلدیو جی کا میلا ہے۔ بلدیو جی کا جہاں مندر ہے وہاں سے دو دو کوس تک باغ اور جنگل سب لوگوں سے بھر جاتے ہیں۔ ہزاروں بساطی اپنی سوداگری کی بساط بچھائے گہنے اور مالا بیچ رہے ہیں:-

اتنے لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہیں آ — جو کہ تل دھرنے کی نہیں ہے جا
لے کے مندر سے دو دو کوس لگا — باغ و بن بھر رہے ہیں سب ہر جا
لاکھوں بکتے ہیں گہنے اور مالا

ہزاروں جنس کی دکانیں لگ رہی ہیں۔ موتی، مونگا خریدنا چاہیے اُس کی بھی کمی نہیں۔ آئینہ کنگھی لینا چاہیے اُس کی بھی افراط ہے۔ حلوائی ایک طرف پیڑے، لڈو، جلیبی، اور گٹے بیچ رہے ہیں۔ کھٹک گولے، نارنگی، سنگترے کی بہاریں دکھا رہے ہیں۔ کہیں مٹی اور کاٹھ کے کھلونے بک رہے ہیں۔ کہیں کا بچھن بیٹھی بیسن چنوا رہی ہے۔

۱۵ میرے ایک معظم مخدوم میرزا محمد علی بیگ جو آگرے میں مدتوں سے وکالت کرتے ہیں اور وہیں اُن کا وطن بھی ہے اس میلے کی نسبت عبارت ذیل تحریر فرماتے ہیں: دہ بیابلدیو جی از ایں شہر بفاصلہ تخمیناً ہشت فرسخ مے شود۔ قصبہ کوچکے بایں نام در ضلع متھرا است۔ ہنود با معبدے آنجا ساختہ اند وایں معبد بسیار قدیم است۔ می دانم کرت شود مگر ہر سال یک مرتبہ مے شود۔

لاکھوں سے بیٹھے بساطی اور سنہار | اپنا سب گرم کر رہے بازار
چوڑی، بنگڑی[۵۱] کی اک طرف جھنکار | نو گرہی، پونچھ، انگوٹھی، چھلے، ہار

۵

سیکڑوں رنگ رنگ کی چھڑیاں | پھول گیندوں کے ہار کی لڑیاں
عیش عشرت کی لٹ رہیں دھنڑیاں[۵۲] | دال موٹھیں، منگوچھی، اور بڑیاں
ہر طرف کھل رہے گل وریجاں | ہار، بدھی، مٹھائی، اور پکوان

باجے انواع طرح کے بج رہے ہیں:-

اک طرف نوبتیں جھنگاریں[۵۳] ہیں | جھانجھ، مردنگ، راس دھاریں ہیں
جھانجھ، مردنگ، دف بجاتے ہیں | راس منڈل بھجن سناتے ہیں

دور دور سے راجہ رجواڑے آئے ہیں۔ پالکی، ہاتھی، گھوڑے۔ رتھ بک رہے ہیں۔ مول تول ہو رہا ہے۔ جوگی، بیراگی، گیانی، دھیانی ہر قسم کی خلقت کا ہجوم ہے۔

یہاں نظیر مولویوں کے فتوے کو کیا مانیں، اور تکفیر کو کیا جانیں۔ گو ہندوؤں کا میلا ہے مگر اپنی اصلی خوش نیتی سے عقل اور شعور سیکھنے کے لیے آگئے ہیں۔ پہلے تو وحدۃ الوجود کی عینک لگا کر ہر طرف اُسی ایک معبود کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ پھر میلے کی تفصیلات پر حکیمانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ لوگوں کا جوق جوق ہر طرف سے آنا،

۵۱ بنگڑی = ایک قسم کی کانچ کی بل دار چوڑی۔
۵۲ دھنڑی پنسیری۔ دھڑیوں بافراط بکثرت پوری طرح سے اٹھائے لطف بھلا کر اُسے مگر یوں مزے لوٹے مسی لیدھ
اب کے ہم نے بھی دھڑیوں مزے لوٹے۔ (نکہت)
۵۳ جھنگار نوبت کی آواز کی ٹکور۔

خرید و فروخت کے بازار کا گرم ہونا، مندر کی طیاری، صحنِ مندر کی نفاست ۴۱، اُس کے گنبد کی رفعت، مکلّف پردوں کا دروازہ پر چھوٹا ہونا۔ گنڈ پر نہان کا ہونا۔ یہ سب باتیں تو خیر ہر معمولی نگاہ دیکھ سکتی ہے (مگر یہ کچھ اِس سے بھی سوا دیکھ رہے ہیں جو معمولی آنکھ دیکھ نہیں سکتی) ان کی آنکھیں عبرت کے روزن سے ڈٹکٹو کا کام کر رہی ہیں۔ لوگوں کو کیا خبر کہ ایک شاعرانہ مذاق کا ڈٹکٹو ہمارے ساتھ ہے۔ وہ میلے کے ہجوم سے استفادہ کر کے اپنے مختلف اغراض کے حصول میں سرگرم ہیں۔ مگر اُن کے تمام افعال اُن کی نوٹ بک میں درج ہو رہے ہیں۔

کہیں عاشق نظارے مار رہے ہیں — سو نگاہوں کی جیت ہار رہیں ہیں
کوئی انبوہ میں رہا ہے کچل — کوئی دھکوں میں کر رہا ہے دَل دَل
کتنے کرتے ہیں جست کود اچھل — کتنے کہتے ہیں مور چھل چھل چھل

"رنگ ہے، روپ ہے، جھمیلا ہے۔ الخ"

کوئی تو کر رہا ہے چھل[۵۱] بٹے — کوئی چڑھاتا ہے کھیر کے چٹّے[۵۲]
ہر طرف گلبدن رنگیلے ہیں — نک پلک غنچہ لب سجیلے ہیں
بات کے ترچھے اور کٹیلے ہیں — دل کے لینے کو سب ہٹیلے ہیں
خشک، تر، نرم، سوکھے، گیلے ہیں — ٹیڑھے، بل دار، اور نکیلے ہیں

۵۱ چھل چھند، چلتر، جگل، پاکھنڈ۔ بٹا مداریوں کے وہ گول گول ڈھکنے جس میں گولیاں رکھ کر غائب کرتے ہیں۔ چھل بٹے فن فریب، مکر و خدع، دم اور دھوکا۔

۵۲ چٹا یا چٹھا چاٹ سے ماخوذ ہے۔ اصل میں اُس مخذا کو کہتے ہیں جو معمولی غذا کے علاوہ تبدیل ذائقہ کے لیے پکایا کرتے ہیں۔ مثلاً فیرنی۔ کھیر۔ یاقوتی رسم ہند کے مطابق چوں کہ یہ چیزیں اکثر میٹھی ہوتی ہیں اس لیے چٹّے کا اطلاق میٹھی چیزوں پر ہونے لگا۔ چٹّے کا میٹھے کے ساتھ مل کر ایک اصطلاح خاص بن جانا یہ بھی اسی کی دلیل ہے۔ چٹّے مٹھوں کا مزہ پڑنا دونوں کی جائے لگنا۔ کھٹّے میٹھے کا مزہ پڑنا۔

جوڑے بھی سرخ، سبز، پیلے ہیں ❊ پیار، اُلفت، بہانے، حیلے ہیں
کوئی چنچل چلے ہے ٹھمکی چال ❊ کچھ وہ پتلی کمر، وہ لمبے بال
آنکھوں میں حسن کے نشے رنگ لال ❊ مصری، ماکھن کے ہاتھوں اُوپر تھال
کچھ وہ پوشاک، کچھ وہ حسن و جمال ❊ مالنوں کا زیادہ اُن سے کمال
ڈال دیں ہار کا گلے میں جال ❊ بدھی[1] ہو کر لیں صاف دل کو نکال
ٹوٹے پڑتے گنواری اور گنوار ❊ جس گنواری کو چلیے دھکا مار
گر کے دے گالی، یوں کہے ہے پکار ❊ "کیسو اٹھلا[2] چلے ہے داڑھی جار"
مٹی اور کاٹھ کے کھلونے ڈھیر ❊ کوئی لیوے ہے کوئی دیوے پھیر
کوئی کمھاری کے کر رہا ہتھ پھیر ❊ کوئی کا چھن کے چُن رہا ہے بیر
کوئی کنجڑن سے لڑ رہا منھ پھیر ❊ کوئی بنیے کو مارتا ہے سیر
گالی، ڈُگ، مار کوٹ سانجھ سویر ❊ لاٹھی پاٹھی ہے، شور و غل اندھیر
سیکڑوں رنگ رنگ کی چھڑیاں ❊ پھول گیندوں کے ہار کی لڑیاں
کہیں چھوٹیں انار، پھلجھڑیاں ❊ کہیں کھلتی ہیں دل کی گلجھڑیاں
کہیں اُلفت سے انکھڑیاں لڑیاں ❊ کہیں باہیں گلے میں ہیں پڑیاں
عیش و عشرت کی لُٹ رہیں دھڑیاں ❊ دال موٹھیں، مُنگوچھی، اور بڑیاں

[1] بدھی وہ پھولوں کا ہار جو بیاہ شادی میں دولہا کے گلے اور بغلوں میں حائل وار باہم متقاطع ڈالتے ہیں۔ یہاں بدھی میں ایک خفیف ایہام بھی ہے۔

[2] اٹھلانا تکلف سے چلنا، نازو انداز سے چلنا، مٹک کر چلنا۔ جان کر اَن جان بننا (اصل میں اینٹھ اینٹھ کر چلنا)۔

لگ رہی بھیڑ اس قدر ٹھٹھ ہو ۔ راہ آگے کو اور نہ پیچھے کو
جو جہاں تھا وہیں پھنسا پھر وہ ۔ جس کو کھینچے ہیں، گر پڑے ہی سو
بیٹھے کہتے ہیں کھا کے دھکوں کو: ۔ "جے مہاراج، رام رام بھجو"
اور گنور دل پکار کر ہو ہو ۔ اب تو لٹھ ڈار ہی لگانے کو ÷

ناچ اور رنگ کے کھڑاکے ہیں ۔ گھنگرو اور تال کے جھناکے ہیں
نقلیں، قصے، کہانی، ساکے[۱] ہیں ۔ کھنڈ، دوہرے کبت کتھا کے ہیں
کہیں آغوش کے لپاکے ہیں ۔ کہیں بوسوں کے سو جھپاکے[۲] ہیں
تھرتھری دانت پر کڑاکے ہیں ۔ قہقہہ چاڑے کے سو جھڑاکے[۳] ہیں ÷

کوئی آکر بہانے اور مِس[۴] سے ۔ مل رہا ہی ملا ہی دل جس سے
ہوتے ہیں آملاپ جس تس سے ۔ لڑ رہا ہی کوئی کہیں رِس[۵] سے
کوئی کھویا گیا ہی مجلس سے ۔ کوئی چلاّئے پوچھیے کس سے
کہنی بازوں میں لگ رہے گھستے ۔ اور دھکا پیل اور گھماں گھستے ÷
نازنیں ہیں وہ سانوری، گوری ۔ جن کی نازک ہر اک پری پوری

دوار دھم ١٩

کہنی اور دونوں لگ رہی کمر سے

---

۱ یہاں ساکے سے وہ داستانیں مُراد ہیں جو کچھ ہندو ایک جگہ بیٹھ کر اپنے نامور بہادروں کے متعلق دل بہلانے کے لیے گا گا کر بیان کرتے ہیں مثلاً آلا اودل کی لڑائی۔ کنور بجے کے معرکے۔ ساکے ہندوؤں میں شاہنامہ اور داستانِ عنتر اور داستانِ امیر حمزہ وغیرہ کے قائم مقام ہیں۔
۲ جھپاکا جلدی سے کوئی کام کرنا۔
۳ جھڑاکا۔ جھپٹ۔ جھڑپ۔ ہلکی سی لڑائی۔ دو دو چونچیں۔ دو دو، تو تو۔
۴ مِس مکر فریب دغا۔
۵ رِس غضب غصہ خفگی ناراضی آزردگی ہٹ ضد اڑ۔

کرکے چتون نگاہ کی ڈوری
دل کو چھینے ہیں سب برا۵۱ زوری

دھوم ناز و ادا جھکا جھوری۵۲
برج میں جیسے مچ رہی ہوری

گھونگھٹوں میں ہیں کر رہی چوری
چوری کیسی کہ صاف سرزوری

خلق آتی ہی سب جٹری جٹری
چیز رکھتے ہیں باندھ کر جکڑی

کوئی دوڑے ہی ہاتھ لے لکڑی
"دوڑیو چور لے چلا گٹھڑی"

جیب۵۳ کتری کہیں گئی پکڑی
کہیں ٹوٹی دُکان اور ہٹڑی۵۴

چور نے تاک لی کہیں پگڑی
سو تماشے، ہنسی، خوشی، پھکڑی

(کلیاتِ نظیر اکبرآبادی)

ہر چند نظیرؔ کی نواسی نے بیان کیا کہ میاں نظیرؔ میلے میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ لیکن خود اُن کی تصانیف میں شواہد اس کے خلاف میں موجود ہیں۔ اُن کے قول کی توجیہہ یوں ہوسکتی ہی کہ شاید بڑھاپے میں اُنھوں نے جانا آنا ضعفِ پیری کے سبب چھوڑ دیا ہو۔ نظیرؔ نے ایک پوری کتاب لکھی ہی جس میں فقط اُنھوں نے اپنے میلے ٹھیلوں میں شریک ہونے کا حال قلم بند کیا ہی اور جو دلچسپ واقعات اُن کو پیش آئے ہیں اُن کو سیاہی کے آبِ حیات سے بقاے دوام بخشی ہی۔ اس کتاب کا نام بزمِ عیش ہی۔ شاید آگرے سے زیادہ دوسرے شہر میں میلے بھی نہ ہوتے ہوں۔ ہر چھوٹی سی بات پر وہاں ایک میلا ہو جایا کرتا ہی۔ تیراکی کے میلے ہیں۔ کنکوے۵۵ کے میلے ہیں۔

۵۱ برا زوری۔ زبردستی دھینگا دھینگی۔
۵۲ جھک جوری دھینگا مشتی چھین جھپٹ ہاتھا پائی توڑا مروڑی نوچا کھسوٹی۔
۵۳ جیب کتری جیب کترنے کا آلہ۔
۵۴ ہٹڑی تصغیر ہاٹ چھوٹی سی دُکان۔
۵۵ کنکوے کے میلے کے متعلق میرے مخدوم میرزا محمد علی بیگ ڈپٹی کلکٹر آگرہ یوں تحریر فرماتے ہیں: "پتنگ بازی ہر شخص نہ خانہ خوردی کنندہ ہر سال بجاہائے مختلف دم مجتمع شدہ یک سہ روز یا دو روز بہم پتنگ بازی می کنند نام آن مجمع تُرجلا می باشد در میدان ے روند و بہ تلہاے بلند باین کار مشغول می شوند۔"
ایک دوسرے آگرے کے دوست سے یوں معلوم ہوا: "پتنگ کے میلے کو تُرجلا کہتے ہیں۔ تُرجلا تاج گنج کے روضے میں بھی ہوتی ہی۔ پیر گیلانی میں بھی ہوتی ہی۔ پیر گیلانی وہ مقام ہی جہاں حضرت ابوالعلا کا مزار ہی۔ شہر سے کوئی ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر ایک مقام ہی جگی بھوگی۔ وہاں بھی ہوتی ہی۔ بڑا میدان ہی۔ کوسوں تک پیچ چلے جاتے ہیں۔"

کبوتر بازی کے میلے ہیں۔ پھر خدا جانے کاہے کے میلے ہیں۔ کاہے کے میلے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں بزم عیش دیکھوں خود کلیات نظیر سے اس کا پورا ثبوت ملتا تھا کہ نظیر سے کوئی میلا چھوٹتا نہ تھا۔ چاہے ہندوؤں کا ہو۔ چاہے مسلمانوں کا۔ بزم عیش کے دیکھنے سے اس خیال کی تصدیق ہوئی آغاز کتاب میں نظیر میلوں کی کثرت کو یوں لکھتے ہیں:۔

اس شہر میں انواع قسم کے مجمع اور فرحت افزا میلے ہوتے ہیں۔ ہر ایک میلے کا نام مشہور ہے اور ہر کے لیے ایک جگہ مقرر ہے۔ میلے کے دن تماشائی بکثرت جمع ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ زرّیں پوشاک پہن پہن کر چاندنی پر صولق افروز ہیں۔ مسندیں بچھائے بچھائے رنڈیاں کہیں تبسم سے گلزار کھلا رہی ہیں۔ اور کہیں ٹہل ٹہل کر سرو رواں کی بہار دکھا رہی ہیں۔ گانے بجانے والوں کا بھی ہر طرف ہجوم ہے۔ پان سے جس کا دیکھو منھ لال لال ہے۔ ہاتھ میں پھولوں کے گجرے پڑے ہوئے ہیں۔ کہیں شراب کا دور چل رہا ہے۔ حقّے چل رہے ہیں۔ سودے والے بھی اپنا بازار جمائے ہوئے ہیں۔''

دسہرے[1] کے دن کی ایک نقل یوں لکھتے ہیں:۔

کہ صبح کے وقت میں جمنا کے کنارے پہنچا۔ دیکھا کہ میلا لگا ہوا ہے۔ گوری گوری صورتوں کی بہار صبح کی صباحت سے زیادہ پیاری۔ اور نہانے میں ان کا پانی سے بھیگا ہوا جسم شبنم سے بھیگے ہوئے پھول سے زیادہ خوش نما۔ کنارے برہمن اپنی بساط بچھائے بیٹھے ہیں اور تلک[2] کی چیزوں سے ان کی بساط رنگین ہو رہی ہے

[1] دسہرا جیٹھ کے مہینہ کی دسویں تاریخ جس میں گنگا اشنان کرنے سے صاحبان ہنود کے اعتقاد کے موافق گناہ دھوئے جاتے ہیں۔ اسوج (آسن) کے مہینے کی دسویں تاریخ کا بڑا بھاری تیوہار جس میں نوروز پہلے سے پوجا وغیرہ کرتے اور اخیر دن دیوی کی مورتی میسو جیا کی سا بھی وغیرہ کو دریا میں گرا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رام چندر جی نے انھی دنوں میں راون پر جس نے سیتا جی کو چرا لیا تھا فتح پائی تھی ان کی لیلا رچاتے اور بڑی خوشی مناتے ہیں۔

[2] تلک قشقہ ٹیکا وہ نشان جو ہندو لوگ صندل یا رولی یا سیندور وغیرہ کا لگاتے ہیں۔ رولی ایک قسم کی سرخ اور خشک چیز جس کا ہندو لوگ تلک لگاتے اور اسے ہلدی پھٹکری اور ترشی سے بناتے ہیں۔ لکھو۔

رشتوں کی چھتری جگمگا رہی ہے اور زرین زین گھوڑوں کی پیٹھ پر چم چم کر رہے ہیں۔

عیاں ہر جا بہار جامہ زیباں	نمایاں نازو حسن دل فریباں
صف اہل تماشا زینت افزا	ہمہ اسباب خوش وقتی مہیا
بروئے نیلگنشہ از زمین بہرہ	نہ بے فرحت فزار و نز دسہرہ

ایک صنم جو نہایت گورا چٹا تھا نہا دھو کر پیشانی پر قشقہ کھینچ کر اپنے گھر کو چلا۔ اُس سے بات کرنے کے شوق میں مَیں بھی اُس کے پیچھے ہو لیا۔ جب میری طرف نگاہ کی میں نے کہا "اے دل آرام جے سیتا رام"۔ مسکرایا اور پوچھا "کیا چاہتے ہو" کہا "عرضِ حال" کہا "فرماؤ" میں نے کہا "سی رامچندر نے لنکا فتح کی اور تمہارے سورما حسن نے میرے دل کا گڑھ

بود در زور دلِ من راون	رام کردند بتاں رام کی سوں

پوچھا "اِس بات کا گواہ" میں نے کہا "ہنومان" ہنسا اور گھر تک مجھ سے باتیں کرتا ہوا ساتھ گیا۔

جس راجہ کے ہاں یہ متعلق تھے۔ اُس کے ہاں بڑی دھوم سے راس[1] کا جشن ہوتا تھا۔ اور اکثر کچھ تو تعلقِ دربار کے سبب اور کچھ شوقِ جبلی کے باعث اُن کو اُس جشن میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ کا حال اِس طرح بیان کرتے ہیں۔

ایک شب میں مجمعِ عالی (راجہ کے ہاں کا جشن مراد ہے) میں پہنچا۔ دیکھا کہ راس کی بڑی تیاریاں ہیں چاندنی سفید نہایت بڑی، دور تک وسعت کے ساتھ بچھی ہوئی ہے۔ لوگ عمدہ عمدہ پوشاک پر تزئین پہنے

[1] راس کھیل ناچ تماشا جیسا سری کرشن نے گوپیوں کے ساتھ کیا تھا جسے راس لیلا بھی کہتے ہیں چنانچہ اب تک کاتک (درگاگن) میں اسی طرح اس کھیل کی نقل کیا کرتے ہیں۔

ہوئے قرینے سے بیٹھے ہیں۔ آداب کے ساتھ گفت گو ہو رہی ہے۔ راس[۵۱] دھاریوں کی زیب و زینت قابلِ دید بوٹی بوٹی شوخی کی ناز سے پڑی پھڑک رہی تھی۔ چمکیلے لباس کی محبوبی بیان نہیں ہوسکتی۔ اور جڑاؤ مکٹ کی سر پر جگمگاہٹ تحریر میں نہیں آسکتی۔ معلوم ہوتا ہے سورج کی کرنیں اُس سے نکل رہی ہیں۔ پھر زہرہ جبیں سکھیاں اور اُن کے زریں پیراہن۔ نرت اس قسم کا ہوتا تھا کہ نگاہ ناچنے لگے اور بھجن[۵۲] اس طور پر گایا جاتا تھا کہ ہر زبان کو ہر بیچ کی رٹ لگ جائے۔ آوازیں جادو۔ اور ساز کے میل میں عقل و ہوش کی ترقی تبکرارِ ہر لیلا ہمان خیالِ پیشینیہ در آئینۂ دیدہ مُہیّا و باظہارِ ہر کردہا ہموں تصورِ شانِ رادھکا[۵۳] و شوکتِ کنہیا بصدائے بانسریِ ادائے نندکشور ن۔ و برسمِ چھاک آوری نیازِ گوپیان و نازِ مدن موہن۔ نہاں گردیدن نندلال چناں کہ ہر سکھی بدم سردی دربیابے کہ "ہیں ہم دوانی پھر دی"۔ وعیاں شدن مدن گوپال چنیں کہ ہر گوپی بجوشِ دلی در صدائے کہ "میں ہر پائی"۔ بعضے بوصول جھانکی[۵۴] مصروفِ الطافِ کنج بہاری۔ و اکثرے بحصولِ درشن مشغولِ گفتنِ "بلہاری"[۵۵]۔ دلہا فرحت امتزاج، و برزبانہا "جی مہاراج"۔

چناں خوش حال گردیدم، کہ در دل	نشاط و عیش و عشرت کرد منزل

۵۱ راس دھاری وہ ناچنے والے لڑکے جو کرشن جی اور اُن کی گوپیوں کے کھیل کی نقل کرتے ہیں۔
۵۲ بھجن خدا کی تعریف کے گیت دیوتاؤں کی تعریف کے گیت۔
۵۳ رادھا رادھکا کرشن جی کی ایک نہایت پیاری گوپی کا نام۔ فقرہ بھجن۔ رادھا کرشن بول تیرا کیا لگے گا مول۔
۵۴ جھانکی دیدلطارہ دیدبازی لیلا نمائش روپ جو پردے کے اندر سے بھر کر باہر دکھاتے ہیں۔ سوانگ تماشا۔
۵۵ بلہاری قربان تصدق صدقہ واری نثار۔
کنہیا جی کی اس کا تک میں ہوتی ہے۔ کنہیا جی کی راس یعنی ایک قسم کی لیلا جس میں ایک شخص کنہیا بنتا ہے۔ سُرخ لباس بر میں زریں مکٹ سر پر۔ ہاتھوں میں بانسری ایک لونڈا رادھکا بنتا ہے۔ کچھ لونڈے سکھیاں اور گوپیاں بنتی ہیں۔ کنہیا جی نرت کرتے ہیں۔ پھر حلقہ بنا کے ہاتھ جوڑ کے ناچتے ہیں۔ اکثر کسی کو پکڑ لیتے ہیں پھر کسی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ سکھیوں سے رمز و کنایے کرتے ہیں۔ مردنگ اور کھنجری بج رہی ہے۔ گھنگرو جھنک رہے ہیں۔
کشن کے مختلف نام ہیں۔ بلدیوبی دہر۔ سیکشن۔ سیام۔ من ہرن۔ مُراری۔ موہن۔ نول کشور۔ بہاری۔ سیام برن۔ اوتاری۔ کنہیا مُرلی دھر۔ من موہن۔ کنج بہاری۔ گوپال۔ منوہر۔ گھنشام۔ اُگل۔ بنواری۔ نندلال۔ نول گردھاری۔ شنکر۔ مُرلیا والے۔ مدن متوارے۔ نند دلارے کشن ہندوؤں کے عقیدے میں گویا خدا ہیں۔

برائے دیدنِ راس مکمل نین	بیایم بعد ازیں بالراس بو العین	

شاید مشکل سے کوئی شاعر مسلمان ایسا نکلے گا جس کے کلام میں اس طرح ہندوؤں کے میلوں اور تقریبوں کی بلا تعصب آزادی اور نیک نیتی کے ساتھ تعریف ہو۔ اس سے ظاہر ہی کہ نظیر کتنا بڑا غیر متعصب آدمی تھا۔ اور نہ صرف یہی بلکہ یہ بھی کہ اُس کو شاعری کا مفہوم کس قدر صحیح معلوم تھا۔ شاعر اگر مذہبی تعصبات کو دخل دے تو گویا وہ اپنے فن کے پہلے اُصول سے قطع نظر کرتا ہی۔ شاعر کا کام یہ نہیں ہی کہ فقط کسی خاص مذہب کے لوگوں کے مرغوبات و منفورات سے واقف ہو۔ اور فقط اُسی ایک مذہب کے لوگوں کو خیالی تفریح بخشے بلکہ اُس کا موضوع عموماً نوعِ انسانی کی طبیعت ہی۔ عید کی تقریب کے بیان سے جو مسرّت اور تفریح کہ کسی مسلمان کے دل میں پیدا ہو سکتی ہی وہ ہرگز کسی ہندو کے دل میں ہو نہیں سکتی۔ گو کتنے ہی عُمدہ الفاظ اور مُحاورات میں کیوں نہ ہو اس لیے کہ اِس تقریب سے اُن کے کسی گزشتہ یا آئندہ مسرت کو بخطِ مستقیم تعلق نہیں ہی۔ بخلاف اس کے اُن کی کسی تقریب کا اگر بیان ہو تو وہی اثر بلکہ شاید بعض موقع پر اُس سے زائد اثر پیدا کر سکتا ہی۔ کنہیا جی کی راس۔ مہادیو جی کا بیاہ۔ بلدیو جی کا میلہ وغیرہ ان کا صرف نام ہی ہندوؤں کے لیے ایک طلسمِ مسرت ہی، اس لیے کہ اُن کی ہزاروں اُمنگیں اور حوصلے ان تقریبوں سے متعلق رہی ہیں اور رہیں اور نہیں معلوم کتنے زمانے تک متعلق رہیں گی۔ پس جس صورت میں کوئی شاعر ہندوؤں کو خوش کرنا چاہے تو تھوڑی دیر کے لیے ہندو بن بیٹھے۔ وہی روزمرے بھی استعمال کرے۔ کہ خصوصیاتِ زبان سے بھی ایک کیفیت غیر محسوس طور پر قلب میں پیدا ہوتی ہی۔ راس۔ کٹ۔ نرت لکھ بلاس۔ برن۔ چندر ماں۔ روپ۔ سروپ۔ اِن میں سے ہر لفظ کسی نہ کسی رگِ نشاط کو حرکت میں لاتا ہی اور آہستہ آہستہ ایک اچھا زمزمہ خوشی اور خوش کیفی کا دل میں پیدا کر دیتا ہی۔

اسی بنیاد پر نظیر مواقع عشرتِ انسانی کے بیان میں کسی خاص مذہب کی قید نہیں رکھتا۔ اور بلا تعصب بیان کرتا ہی۔ کہ ہر مذہب کا آدمی اُس سے متلذذ ہو سکے۔

کچھ ایسا بھی معلوم ہوتا ہی کہ نظیر کے دل میں وحدۃ الوجود کا مسئلہ بڑے زور سے جما ہوا تھا اور وہ ہر شے کو مظہرِ صفاتِ الٰہی و ذاتِ باری جانتا تھا۔ اور ہر ذرے میں اُسی کا جلوۂ ظہور مانتا تھا۔ پس مہادیو کرشن وغیرہ اُس کے نزدیک کیوں کر قابل نفرت ہو سکتے ہیں جن کی ذات بروایتِ ہنود مظہر کرامات بھی تھی۔ نظیر اصل میں کبیر، گرونانک وغیرہ کے عقیدے کا آدمی تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو افراط اور تفریط کے عالم میں جانتا تھا۔ اور صُلحِ کُل کا جویا تھا۔ صُلحِ کُل بھی پھر اس طریقے سے کہ سب ایک ہی صانع کے بنائے ہوے ہیں۔ آدمی آدمی سب برابر۔ عداوت کی وجہ کیا۔ مذہب میں جو فرق ہی وہ الفاظ کا فرق ہی معانی سب کے ایک ہیں۔ ہنود جس کو اوتار کہتے ہیں مسلمان اُسی کو پیغمبر کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں معلوم ہوتا ہی نظیر کو ہندوؤں کی بھی بہت صحبت رہی تھی۔ اور اُن کے علما کے خیالاتِ تصوف سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اسلیے کہ تا وقتیکہ مدتوں آدمی ہندوؤں میں نہ بیٹھا ہو، اُن کے محاورات اس بے تکلفی کے ساتھ باندھ نہیں سکتا۔ اور اتنے دل نشین حالات قلم بند نہیں کر سکتا۔

دریا کی سیر میں تو ہم نے میاں نظیر کو کلیات میں بھی مصروف دیکھا ہی۔ تیراکی کا میلا یاد ہوگا۔ قدر متین میں بھی ایک جگہ وہ دریا کے شوق کی لہریں دکھاتے ہیں۔ وہ روز عام نہان کا تھا۔ میلا قابلِ دید تھا۔ پیدل جانا منظور نہیں۔ سواری موجود نہیں۔ ناچار ایک دوست سے بذریعہ خط کے رتھ منگوائی تھی۔ اُن دنوں بگھی اور فٹن کا رواج نہ تھا۔ بڑے بڑے اُمرا رتھوں پر سوار ہوتے تھے۔ اور رتھوں میں بڑی تیاری کی جاتی تھی۔ چاندی سونے کے کلس۔ مخمل کی چھتری۔ ہزار ہزار روپے جوڑی کے گجراتی بیل۔

رقعۂ طلب یوں شروع ہوتا ہے:-

محیطِ بخشش و بذلِ استقامت	ملاذ و منبعِ احسان سلامت
چو شوقِ صحبتِ رنگین نگارم	ہمانا موجِ دریا در شمارم
مگر بعد از سلامِ الفت آرا	بنوکِ خامہ آرم مدعا را
کہ امروز از برائے غسلِ دریا	جہانے حاضر، و خلقے ست یکجا
چنیں مجمع نباشد جائے دیگر	بجوشش آمد مگر دریائے دیگر
نظر نامی رسد یکسر بہارست	چمن بر ساحلِ دریا نثارست
ز غسلِ مردمان و بازیِ آب	بہر سو شوخیِ گرداب بیتاب
ز عکسِ گلعذاراں آبِ دریا	برنگِ نہرِ گلشن در نظرہا
بساحل بسکہ مہ رویاں عیانند	شکارِ دامِ الفت ماہیانند
بفرحت قطرہ زن ہر موجِ آب است	مئ مقصود در جامِ حباب است
بہارِ حسن و آبِ بحر در جوش	ہم پہلو بہ پہلو، دوش بر دوش
چو بر دریا چنیں رنگیں بہارست	دلم از بہرِ آن پُر بے قرارست
دریں صورت نظر بر بے قراری،	عطا سازند رتھے بہرِ سواری
چو زاں مجمع ہمہ شادند امروز	کنم من ہم دلِ خود عشرت اندوز
کہ باشد دیدنِ عالم غنیمت	اگر یک لحظہ باشد دم غنیمت
نظیر اکنوں ندارد غیر ازیں یاد	کہ باشد خانۂ الطاف آباد

بزمِ عشرت میں شرکت:

کسی عشرت کی بزم میں ایک شوخ دل فریب کے ناچ سے میں لطف اٹھا رہا تھا۔ اُس کے کانوں کے جُھمکے اِس طرح سے جھوم رہے تھے کہ ہزاروں بے قراریاں دل میں پیدا ہوتی تھیں۔ اور بازو کے بانک[1] اپنی قربت کے سبب دونوں ہاتھوں سے تسلیمِ نیاز چاہتے تھے۔ میں نے دونوں کی تعریف یوں موزوں کی ؎ جُنبشِ جھمکہ تو می سازد ٭ خاطرِ آرمیدہ را بیتاب ٭ ؎ بانک بر بازوے تو اے سیمتن، از حسن خم ٭ می نماید ایں کہ من ہم بانکباز طرفہ ام ٭ سُن کر وہ عورت بہت ہی خوش ہوئی۔

دوالی

ہی دسہرے میں بھی یوں گو فرحت و زینت نظیر	
پر دوالی[2] بھی عجب پاکیزہ تر تیوہار ہی	

درشبِ دوالی کہ بلطفِ آں در و دیوار مجلّی و نگاریں می شود، و ہر بام و برآمدہ زیبا و رنگیں۔ نازنینانِ بلباس درخشاں، و الفت گزنیاں بکامِ دل شاداں۔ در بازار بازارِ زینت، و ہر دکاں دکانِ رونق دکانداران مسرور۔ و نظارگیان پُر سرور۔ چراغاں صفِ ترصیع بستہ، و لمعاتِ آں بسوّیت پیوستہ (ابیات) ز شیرینی دکانہا زینت ارقام ٭ عیاں سیم دگر با پستہ بادام ٭ فراواں خوش دلی در ہر قیاسے ٭ نمایاں جا بجا کھیلیں بتاسے ٭ کسے کھرما[3] طلب از لطف یابی ٭ کسے مسرور برفی و گلابی ٭ کسے دیداز

---

[1] بانک ایک قسم کا زیور جو ہندنیاں پاؤں میں اور مسلمانیاں بازو پر پہنتی ہیں۔ بانک فن سپہ گری میں سے ایک ورزش کا نام ہی جسے بکیتی کہتے ہیں اور اُسے کٹار نما ٹیڑھی چُھریوں سے بیٹھ کر یا لیٹ کر کھیلتے ہیں۔

[2] دوالی ہندوؤں کا ایک مشہور تہوار جس میں لچھمی کی پوجا ہوتی اور بہت سی روشنی کی جاتی ہی۔ یہ تہوار کاتک کی پندرہ تاریخ کو ہوتا ہی۔ اسمیں ہندو کثرت سے جوا کھیلتے ہیں اور چور چوری کو نکلتے ہیں۔ اُنکے اعتقاد میں آج کی جیت سے برس روز تک جیت رہتی ہی۔

[3] کھرما چھوہارا کھجور یا لوشاہی ایک قسم کی مٹھائی۔

تلنگنی[1] دل فریبی ؛ کسے خوش حال از لطفِ جلیبی ؛ کسے مشغول گند وسیو، متھری ؛ کسے گجرے بکف ، بر دوش ہتھری ؛ کسے را اسپ خواہش در تنگ و تازہ ؛ کہ گیرد اسپ خوش رنگ و پر از سازہ ؛ کسے را دل دریں اُمید واری ؛ کہ گیرد فیل با زریں عماری ؛ کسے تکرار در گھر بہل خوشتر ؛ کسے را بحثِ طوطی بہر دیگر ؛ کسے بہر خیالِ طبع عالی ؛ گرفت از شوق فانوسِ خیالی ؛ بریں اشیائے بازی طرفہ و بہ ؛ خریداراں فراہم از کہ و مہ ؛ از مہ طلعتے ملاقات گردید و ہم سخنی دست داد۔ گفت "حسنِ ایں چراغاں چہ قدر" گفتم "چناں کہ شمع رویاں بمشاہدۂ آں ، یا چراغ افروز مراد از دیدن ایشاں متبسم گردید۔"

ہندوؤں کا ایک تیوہار ہے سلونو۔ اس تیوہار میں برہمن ہاتھوں میں راکھی باندھتے پھرتے ہیں۔ اور زر و دھان کی کوپلیں بانٹتے ہیں۔ نظیر تو ہندو مسلمان سب کے ہوا خواہ ہیں۔ اُن کو اس تیوہار سے بھی لطف اُٹھانا۔

چلی آتی ہے اب تو ہر کہیں بازار کی راکھی[2]
سنہری، سبز، ریشم، زرد، اور گلنار کی راکھی
بنی ہے گو کہ نادر، خوب ہر سردار کی راکھی
سلونو میں عجب رنگیں ہے اُس دلدار کی راکھی
نہ پہنچے ایک گُل کو یار جس گلزار کی راکھی

عیاں ہے اب تو راکھی بھی، چمن بھی، گُل بھی شبنم بھی
جھمک جاتا ہے موتی، اور جھلک جاتا ہے ریشم بھی
تماشا ہے اہا ہا ہا! غنیمت ہے یہ عالم بھی
اُٹھانا ہاتھ پیارے، واہ وا ٹُک دیکھ لیں ہم بھی

[1] تلنگنی ایک قسم کی شیرینی جو نہایت پتلی شیشے کی شکل کی بنائی جاتی ہے۔ اس میں خربزے کے بیج کالی مرچیں کھانڈ ڈال کر قوام پکاتے اور اُس کے کوزے بنا لیتے ہیں۔ ابتدا میں بیجوں کے بجائے تِل ڈالا کرتے تھے اور یہی وجہ سے اس کا نام تِل انگنی رکھا تھا۔
[2] راکھی ہاتھ کی رکھشا یعنی محافظت کرنے والا۔ وہ رنگین تاگا یا ایک خاص وضع کا چکن دار کنگن جو ہندو لوگ سلونو کے تہوار پر ہاتھوں میں برہمنوں سے بندھواتے یا بہن اپنے بھائی کی کلائی میں باندھ دیتی ہے تاکہ وہ بلیات سے محفوظ و مصئون رہے۔

تمھارے موتیوں کی اور زری[1] کے تار کی راکھی

مچی ہی ہر طرف کیا کیا سلونو کی بہار اب تو
ہوس جو دل میں گزرے ہی کہوں کیا، آہ! میں تم کو
ہر اک گلرو پھرے ہی راکھی باندھے ہاتھ میں خوش ہو
یہی آتا ہی جی میں بن کے باہمن[2] آج تو یارو
میں اپنے ہاتھ سے پیارے کے باندھوں پیار کی راکھی

ہوئی ہی زیب و زینت اور خوباں کو تو راکھی سے
دِوانی بلبلیں ہوں دیکھ، گُل چُننے لگیں تنکے
ولیکن تم سے اے جاں، اور کچھ راکھی کے گل پھولے
تمھارے ہاتھ نے، مہندی نے، انگشتوں نے، ناخن نے
گلستاں کی، چمن کی، باغ کی، گلزار کی راکھی

ادا سے ہاتھ اُٹھنے میں گُلِ راکھی جو ہلتے ہیں
کہاں نازک یہ پہنچے، اور کہاں یہ رنگ ملتے ہیں
کلیجے دیکھنے والوں کے کیا کیا آہ! چھلتے ہیں
چمن میں شاخ پر کب اس طرح کے پھول کھلتے ہیں
جو کچھ خوبی میں ہی اُس شوخ گل رخسار کی راکھی

نسخے

پھریں ہیں راکھیاں باندھے جو ہر دم حُسن کے تارے
پہن زُنّار اور قشقہ لگا ماتھے اُپر بارے
تو اُنکی راکھیوں کو دیکھ اے جاں چاؤ کے مارے
نظیر آیا ہی باہمن بنکے راکھی باندھنے پیارے
بندھا لو اُس سے تم ہنس کر اب اس تیوہار کی راکھی

بزم عیش میں فرماتے ہیں:- سلونو عجب لُطف رکھتا ہی کہ نمک سے شکر نکلتا ہی۔ سے نمایاں عالمے بازینت و شاں ٭ ز راکھی زیبِ ہر ساعد فراواں ٭ ازاں راکھی کہ در دستِ بُتاں ہست ٭ بہارِ طُرفہ

[1] زری سُنہری تار سونے کے تار چاندی کے تار جنپر سونے کا ملمع ہو۔

[2] باہمن یا باھمن ہندوؤں کی نہایت افضل ذات برہما کے ویدوں کا عالم۔ صحیح برہمن ہی۔

بہرِ عاشقاں سست ؀ ایک دفعہ سلونوں ہی کے دن ایک برہمن، جس کی ہمرازی کا ٹیکا دل کی پیشانی پر اور دمسازی کا زُنار خاطر کے کندھے پر رکھتا تھا، ایک صنم کے گھر گیا۔ جب راکھی کی بہار اُس کے ہاتھ میں دیکھی تو یہ شعر پڑھا ؎ راکھی اگرچہ باہمگی سازمیکند ؀ لیکن عجبِ دستِ بُتاں نازمی کند ؀ ہنسا اور کہا "مصر تو راکھی باندھنے کے لیے آئے، تم کس لیے آئے؟" ۔ میں نے کہا "دل باندھنے کے لیے" بہت ہنسا۔

بسنت[1] کا زمانہ بھی عجب جوش انگیز زمانہ ہوتا ہے آفتاب دکھن کے سفر سے پھر مہربانی کے سامان کے ساتھ پلٹتا ہے۔ نباتات وحیوانات میں تازہ زندگی آتی ہے۔ شاخوں پر سبز، حریری کونپلیں نمودار ہوتی ہیں۔ ٹہنیوں پر چڑیوں کے طِلسم انگیز نغمے سُنائی دیتے ہیں۔ دلوں میں اُمنگ زور کرتی ہے اور خوشی اور عیش کے فوّارے کو خوش نما طور پر اُچھالتی ہے۔ نیچر کا بہار راگ غم اور کُلفت کے اُداس بن میں اِس سرے سے اُس سرے تک آگ لگاتا ہے۔ فطرتی شاعر خیال کی شاخ پر بیٹھ کر کوئل سے زیادہ مست ہوتا ہے اور پپیہے سے زیادہ دل آویز اور طلسم انگیز تانیں سُناتا ہے۔

بسنت کا زمانہ آگیا ہے۔ گلابی جاڑا پڑتا ہے۔ اعتدال کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی ہیں۔ طبیعتیں جو سردی کے اثر سے ڈوبی ہوئی تھیں، آہستہ آہستہ اُبھرنے لگی ہیں۔ قدرتی جوش ترنم کا ہر سر میں ہو رہا ہے۔ وہ دیکھیے میاں نظیر بیٹھے گُنگنا رہے ہیں۔ کچھ آزادوں کا سا لہجہ معلوم ہوتا ہے، مگر راہ اچھی ہے :۔

جب پھول کا سرسوں کے ہوا آکے کھلنا	اور عیش کی نظروں سے نگاہوں کا لڑنا

[1] بسنت ہندی چھ رُتوں میں سے ایک رُت کا نام ہے جو چیت سے بیساکھ تک رہتی ہے۔ موسم بہار۔ وسط مارچ سے آخر مئی تک کا موسم۔ وہ میلہ جو موسم بہار میں بزرگوں کے مزار اور دیہی دیوتاؤں کے استھانوں پر سرسوں کے پھول چڑھا کرتے ہیں۔

ہم نے بھی دل اپنے کے تئیں کر کے بنجتا — اور ہنس کے کہا یار سے[۱] اے لکڑ بھونتا

سب کی تو بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا

اک پھول کا گیندوں کے منگا یار سے بجرا[۲] — دس من کا لیا یار گندھا ہاتھ کا گجرا
جب آنکھ سے سورج کی ڈھلا رات کا کجرا[۳] — جا یار سے مل کر یہ کہا "ای مرے رجرا[۴]"

"سب الخ"

تھے اپنے گلے میں تو کئی من کے پڑے ہار — اور یار کے گجرے بھی تھے اک دھون[۵] کی مقدار
آنکھوں میں نشے مے کے ابلتے تھے دھواندھار — جو سامنے آتا تھا یہی کہتے تھے للکار

"سب الخ"

پگڑی میں ہماری تھے جو گیندوں کے کئی پیڑ — ہر جھونک میں لگتی تھی بسنتوں کے تئیں ایڑ
ساقی نے بھی مٹکے سے دیا منھ کے تئیں بھیڑ — ہر بات میں ہوتی تھی اسی بات کی آچھیڑ

"سب الخ"

پھر راگ[۶] بسنتی کا ہوا آن کے کھٹکا — دھونسے[۷] کے برابر وہ لگا باجنے[۸] مٹکا

۱؎ اس لفظ کی کوئی تحقیق نہ ہو سکی۔ دونوں نسخوں میں لکڑ بھونتا لکھا ہے۔ آزادوں کے لہجے میں لڑکے کو لکڑا، اور لکڑے کو تخفیف لکڑ کر لیا ہو تو عجب نہیں اور بھونتا دل کو بھانے والا۔ اے لکڑ بھونتا یعنے ای خوش ادا لڑکے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اکڑ بھونتا ہو اور انقلاب تصحیف سے موجودہ قالب میں در آیا ہو۔ اکڑ بھونتا اکڑ بھوں یا اکڑوں کا آزادانہ لہجہ۔
۲؎ بجرا ایک بڑی قسم کی گول اور خوش نما کشتی جس میں امیر لوگ بیٹھ کر سیر کرتے ہیں۔
۳؎ کجرا کاجل کا آزادانہ لہجہ۔
۴؎ رجرا راجہ کی تصغیر آزادوں کی گرامر کے مطابق۔
۵؎ دھوں ایک بیس سیر کا وزن۔ آدھا من۔ جیم ادھون ہے۔ دھیلے کی طرح الف یہاں بھی تخفیف میں آیا۔
۶؎ بسنت سری راگ کی چوتھی راگنی۔
۷؎ دھونسا دمامہ بڑا نقارہ۔
۸؎ باجنے بجنے کا لہجہ آزادانہ۔

دل کھیت میں سرسوں کے ہر اک پھول سے اٹکا
ہر بات میں ہوتا تھا اسی بات کا لٹکا

"سب الخ"

جب کھیت پہ سرسوں کے دیا جاکے قدم گاڑ
سب کھیت اٹھا سر کے اوپر رکھ لیا جھاڑ

محبوب رنگیلوں کی بھی اک ساتھ لگی جھاڑ[۱]
ہر جھاڑ سے سرسوں کے بھی کہتی تھی یہی جھاڑ

"سب الخ".

خوش بیٹھے ہیں سب شاہ و وزیر آج، اہا ہا!
دل شاد ہیں ادنیٰ و فقیر آج، اہا ہا!

بلبل کی نکلتی ہے صفیر آج، اہا ہا!
کہتا ہی پھرتا ہے نظیر آج، اہا ہا!

"سب کی تو بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا"

اب جوش میں کسی قدر اعتدال آیا تو پھر یوں گاتے ہیں:-

نکلے ہو کس بہار سے تم زرد پوش ہو
جس کی نوید پہنچی ہے رنگِ بسنت کو

دی بر میں اب لباسِ بسنتی کو جیسے جا
ایسے ہی تم ہمارے بھی سینے سے آ لگو

گر ہم نشے میں بوسہ کہیں دو۔ تو لطف سے
تم پاس منھ کو لاکے، یہ ہنس کر کہو کہ "لو"

بیٹھو چمن میں نرگس و صد برگ کی طرف
نظارہ کرکے عیش و مسرت کی داد دو

سن کر بسنت مطربِ زریں لباس سے
بھر بھر کے جام پھر مئے گلرنگ کے پیو

کچھ قمریوں کے نغمے کو دو سامعے میں راہ
کچھ بلبلوں کا زمزمۂ دل کشا سنو

"مطلب ہے یہ نظیر کا یوں دیکھ کر بسنت"

۱؎ جھاڑ تار، سلسلہ، قطار، تسلسل۔

ہو تم بھی شاد، دل کو ہمارے بھی خوش کرو

ایک یار سے تو یوں مزے مزے کی باتیں ہوئیں۔ اب دوسرے صنم تشریف لاتے ہیں:۔

مل کر صنم سے اپنے ہنگامِ دل کشائی
ہنس کر کہا یہ ہم نے "اے جاں بسنت آئی"

سنتے ہی اُس پری نے گُل گُل شگفتہ ہوکر
پوشاک زر فشانی اپنی وُہیں رنگائی

جب رنگی آئی اُس کی پوشاکِ پُر نزاکت
سرسوں کی شاخِ پُر گُل پھر جلد اک منگائی

اک پنکھڑی اُٹھا کر نازک سی اُنگلیوں میں
رنگت کو اُس کی اپنی پوشاک سے مِلائی[1]

جس دم کیا مقابل کسوت سے اپنی اُس کو
دیکھا تو اس کی رنگت اُس پر ہوئی سوائی

پھر تو بصد مسرت، اور سو نزاکتوں سے
نازک بدن پہ اپنے پوشاک وہ کھپائی

چمپے کا عطر مل کر موقع سے پھر خوشی ہو
سیمیں کلائیوں میں ڈالے کڑے طلائی

بن ٹھن کے اِس طرح سے پھر راہ لی چمن کی
دیکھی بہارِ گلشن ہر طرب فزائی

جس جس روش کے اوپر جا کر ہوا نمایاں
کس کس روش سے اپنی آن دادا دکھائی

کیا کیا بیاں ہو جیسے چکی چمن چمن میں
وہ زرد پوشی اُس کی، وہ طرزِ دلرُبائی

صد برگ نے صفت کی، نرگس نے بے تامّل
لکھنے کو وصف اُس کا، اپنی قلم اُٹھائی

پھر صحن میں چمن کے آیا بحُسن و خوبی
اور طُرفہ تر بسنتی اک انجمن بنائی

---

[1] تانیثِ فعل باوجود اظہارِ علامتِ مفعول اور اساتذہ کے کلام میں بھی ہے۔ مرزا رفیع السّودا فرماتے ہیں:۔ ڈالی بازار جو سودا نے متاعِ دل کو۔ ٹٹ گئی دیکھتے ہی جنسِ خریدار کی طرح۔

مولوی عبد القادر سورہ بروج کے ایک فائدے میں لکھتے ہیں:۔ پھر شہر میں ہر محلّے کے آگے کھائی کُھدوائی۔ اُسے آگ سے بھری۔ یہ محاورہ اب بھی زبانوں پہ ہے۔

اُس انجمن میں بیٹھا جب ناز و تمکنت سے — گلدستہ اُس کے آگے ہنس ہنس بسنت لائی
کی مطربوں نے خوش خوش آغازِ نغمہ سازی — ساقی نے جامِ زریں بھر بھر کے مے پلائی

دیکھ اُس کو اور وہ محفل اُس کی نظیر ہر دم
کیا کیا بسنت آکر اُس وقت جگمگائی

دوسرا راگ سنیے۔ ایک یار کی ڈیوڑھی پر جاکر گا رہے ہیں:۔

جوش نشاط و عیش ہے ہر جا بسنت کا — ہے طرفہ روزگار طرب زا بسنت کا
باغوں میں لطفِ نشو و نما کی ہیں کثرتیں — بزموں میں نغمہ خوش دلی افزا بسنت کا
پھرتے ہیں کر لباس بسنتی وہ دل براں — ہے جن سے زرنگار سراپا بسنت کا
جا در پہ یار کے یہ کہا ہم نے صبح دم: — "اے جاں، ہے اب تو ہر کہیں چرچا بسنت کا
تشریف تم نہ لائے جو ہو کر بسنتی پوش — کیسے گناہ ہم نے کیا کیا بسنت کا"
سنتے ہی اس بہار سے نکلا کہ جس کے تئیں — دل دیکھتے ہی ہو گیا شیدا بسنت کا

اپنا وہ خوش لباس بسنتی دکھا نظیر
چمکایا حسنِ یار نے کیا کیا بسنت کا

یہ تو ہندی راگنیاں ہوئیں۔ اب بعض عجمی مقام سنیے:۔

زہے بسنت کہ آغازِ سرمایۂ بہارست وشروعِ پیرایۂ برگ و بار۔ بلبل بہوائے بوسہ پاے گل سراز زیرِ بال برکشید و قمری بتمنائے نظارۂ بالائے سرو، از کنجِ آشیاں پرید۔ شاخِ گلبن از غنچہ وگل زیبِ نیمدن یافت و شمشاد و صنوبر باہتزازِ صبا زینتِ چیدن نسیم سحری شگفتگی افزود۔ و بادِ بہاری چہرۂ خرمی نمود

نہالِ شوق بوفورِ بالیدن۔ وشاخِ تمنّا مسرورِ نو دمیدن حسن بآرایش، وعشق بافزایش۔ نغمہ سازان بسرائیدنِ بسنت طرب فزا وترنم پردازان بترانۂ عندلیباں ہم صدا۔ ہر جا بزمِ نشاط، وہر مکان محفلِ انبساط

از جوشِ بہارِ زرفشانی		دلہا بہزار شادمانی	
وز کثرتِ خلعتِ طلائی		سامانِ ہزار دل کشائی	

وقتے بروزِ بسنت بہرِ نظارۂ نازنینانِ نوبہار ودل فریبانِ بسنتی شعار برآمدم۔ چوں وارِدِ کوچۂ گردیدم۔ چندیں نازنینِ بسنتی لباس را بہ سازِ طرب دیدم مسرور شدم وگفتم ؎ چہ جائے غیرِ چنیں ہست ایں لباسِ بسنت ✣ کہ دا ہجلوہ گر باید زدستِ سادہ[۱] بسنت ✣ تبسّم کردند وبجائے ترصّدِ زر متوجہ شدند۔

[۱] سادہ بے وقوف مودھو بوند وبجولا بجالا ابدھا سادہ میر۔ ہر صبح جو خورشید ترے منہ پہ چڑھے ہے ✣ ایسا نہ ہو یہ سادہ کہیں جی سے اُتر جائے ✣ ایضاً کوئی سادہ ہی اُس کو سادہ کہے۔ لگے ہے ہمیں وہ تو عیار سا۔ سادہ بسنت اُتو بسنت۔

نظیر دہلی سے آگرے جاتا ہی

ابھی تک نظیر دہلی میں تھا۔ مگر اب سین بدلتا ہی۔ دہلی جہاں وہ پیدا ہوا جہاں اُس نے پرورش پائی جہاں وہ جوان ہوا اُس کو ایک تازہ اور بڑی آفت کا سامنا ہی۔ نادر[51] کو اپنی خوں ریزیوں کا سکہ بٹھا کر گئے ہوئے زیادہ زمانہ نہیں ہوا۔ ظالم کی عمر کوتاہ گو وہ اِس جہان سے جا چکا ہی مگر احمد شاہ دُرّانی اُس کا جانشین موجود ہی اُس کے دو حملے متواتر ہو چکے ہیں۔ گو پہلے حملے میں سرہند[52] کے میدان میں محمد شاہ کی خوش قسمتی سے احمد شاہ اس کے بیٹے کے ہاتھ سے شکست کھا کر اُس کو لوٹ جانا پڑا تھا مگر محمد شاہ کی آنکھ بند ہوتے پیچھے[53] اب تو وہ لاہور اور مُلتان دونوں کو دبائے بیٹھا[54] ہی بادشاہ[55] سلامت ایک نامرد مگر مُنہ چڑھے خواجہ سرا کے مارے جانے سے اپنے وزیر اعظم صفدر جنگ (صوبہ دار اودھ) سے بیزار ہیں اور انتقام کی تدبیریں سوچ رہے ہیں۔ غازی الدین اگرچہ صفدر جنگ ہی کا بڑھایا ہوا ہی اور سپہ سالاری کے رُتبے کو اُسی کا پہنچایا ہی۔ مگر اِس نامردانہ کام میں بادشاہ کا دست و بازو بنتا ہی۔ اِس اختلاف کے سرچشمے سے شہر میں خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ ہولکر آن کر اِن ندّیوں پر پُل باندھتا ہی۔ صفدر جنگ مصلحت وقت سمجھ کر کنارے ہو جاتا ہی گو بادشاہ

---

[51] نادر کا حملہ ۱۷۳۹ء میں ہوا تھا۔

[52] احمد شاہ نے دُرّانی کو مارچ ۱۷۴۸ء میں میدان سرہند میں شکست دی تھی۔

[53] محمد شاہ اپریل ۱۷۴۸ء میں مرا۔

[54] دُرّانی کا دوسرا حملہ ۱۷۵۱ء میں ہوا تھا۔

[55] احمد شاہ

پہلے سے آنکھیں کھوئے بیٹھا تھا گر جب غازی الدین کی بے اعتدالیوں سے اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے اور چشم نمائی کے لیے شہر سے باہر جاتا ہے تو بعوض اس کے کہ کامیابی اُس کو آنکھیں نکالنے کا موقع دے شکست خود اُس کی آنکھیں نکلواتی ہے[1]۔ اور اہل نظر سے آیہ فاعتبروا یا اولی الابصار پڑھواتی ہے۔ عالم گیر ایک ناتجربہ کار شخص اس کا جانشین ہوتا ہے۔ غازی الدین اس سے وہ کام لیتا ہے جو کٹھ پتلی والے کٹھ پتلیوں سے لیتے ہیں۔ اپنے حریف صفدر جنگ کے مرنے کے بعد آپ وزیر اعظم بنتا ہے۔ مگر اس بڑے عہدے کی عزت سنبھال نہیں سکتا۔ ظالمانہ کارروائیاں اُس کی اہل لشکر کو بیزار کرتی ہیں۔ اور اُنھیں کے ہاتھ سے اُس کو سر و پا برہنہ سڑکوں پر گھسٹواتی ہیں۔ اپنی سنگ جانی سے بچ نکلتا ہے اور سنگ دلی سے تمام باغیوں کو خون میں نہلاتا ہے۔ پھر دماغ جو چلتا ہے تو دُرانی کے مقابلے کے حوصلے ہوتے ہیں۔ پنجاب تشریف لے جاتے ہیں اور دُرانی کے جانشین کو غرفش دکھاتے ہیں۔ دُرانی ایسے کتوں کو کب خاطر میں لاتا ہے۔ بجلی کی طرح انڈس پار اُترتا ہے۔ اور جنگی سونٹے سے ان کی خبر لیتا ہے۔ یہ دُم دبا کر انقیاد و اطاعت کے خیموں میں گھستے پھرتے ہیں[2]۔

اہل دہلی جن کے نگاہوں کے سامنے نادر کی تصویر لباس خونی میں پھر رہی ہے اُن کے دلوں کا اس وقت کیا حال ہوگا۔ اُس قیامت صغرےٰ کو ابھی پورے اٹھارہ برس نہیں ہوے۔ لوگوں کے دلوں سے ابھی عزیزوں کے داغ نہیں بھولے۔ سیکڑوں مکان ابھی تک بے مکیں پڑے ہوے ہیں۔ آباد نہیں ہوے۔ ہزاروں عورتیں ہنوز اپنے لٹے ہوے زیوروں کو رو رہی ہیں پورے بن نہیں چکے۔ نظیر کو گو نادر کے حملے کے

[1] احمد شاہ ۱۷۵۴ء میں تخت سے اُتار گیا اور اسی سال اُس کی آنکھیں نکلوائی گئیں۔ غازی الدین نے نکلوائیں۔

[2] یہ ۱۷۵۷ء کا واقعہ ہے۔ دُرانی کا تیسرا حملہ یہی ہے جس میں وہ دہلی آیا اور نادر شاہ کے واقعہ خون ریزی کو تازہ کر دیا۔

وقت ہوش نہ تھا مگر ہوش سنبھلتے ہی وہ اُس کی ہوش اُڑانے والی داستانیں سُننے لگا۔ چشم دید بیان کرنے والوں کی گزشتہ خوف کے تصور سے پتھرائی ہوئی آنکھیں اور اوپر کو کھنچی ہوئی بھنویں اُس کے آغازِ عمر کے توہم آمیز دل پر نقش کالحجر ہو گئی ہیں۔ عجب نہیں اگر وہ گہوارے میں بھی نادر کے تذکروں سے ڈرایا گیا ہو۔ نادر کو وہ آدمی سے کچھ زیادہ اور دیو سے کچھ کم سمجھتا ہے اور کیوں کر نہ سمجھے کہ گھر کی عورتیں اُس کا نام سُنتے ہی کانپ اُٹھتی ہیں اُن کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور قریب قریب اُن پر وہ عالم طاری ہوتا ہے جو تسلیط کے وقت آسیب زدوں پر ہوتا ہے۔

دُرّانی کے دہلی آنے کی خبریں شہر میں گرم ہیں۔ بقول عقلائے فرنگ۔

بُری خبروں کے لگ جاتے ہیں پر سے

یہ خبریں بُرائی کے اُنھی ضرب المثل پروں سے اُڑتی پڑتی نظیر کے گھر میں بھی پہنچی ہیں گھر کی عورتوں کے دل تو وہ تھے کہ اگر لوگ جھوٹوں بھی کہتے تو وہ سچ جانتیں چہ جائے کہ یہاں تو بدقسمتی سے خبر بھی سچ تھی سُنتے کے ساتھ سب کے ہوش جاتے رہے۔ عورتوں کا بڑا بنک ہی زیور۔ اس پر پنڈول کا پہرہ بٹھایا گیا۔ شاید یہ پہرا نادر کے حملے کے وقت بھی مُفید ہوا ہو۔ اور نظیر سے بُلا کر کہا گیا کہ بابا یہ شہر اب رہنے کے قابل نہیں۔ تم کو کیا خبر۔ تم اس مصیبت کو کیا جانو۔ ہم لوگ اپنی آنکھوں سے اُس ولایتی گدڑیے کے کرتوت دیکھ چکے ہیں۔ سوا پہر شہر میں لہو کی ندیاں بہتی رہیں۔ لوگوں کے سر کٹوروں کی طرح تیرتے پھرتے تھے۔ لوٹ مچی تو ایسی کہ دو مہینے تک ولایتیوں نے دم نہ لیا۔ گھر گھر گھُستے پھرتے تھے اور جان مال آبرو سب پر ہاتھ مارتے تھے۔ دُرّانی بھی آخر اُسی کا چیلا ہے۔ یہ بھی زہری کا بُجھا ہوا ہوگا۔ اُس دفعہ نہیں معلوم کیوں کر ہم لوگوں کا گھر بچ گیا۔ شاید غریبی آڑے آئی ہو۔ مگر اب کے بچنے کی کوئی شکل نہیں۔ جس طرح بنے یہاں سے جلد نکل چلو۔ شہر میں

بھاگ کر جمع ہو چکی تھی۔ اس پر عورتوں کی اشک آلود تقریر۔ نظیر بے چین ہو گیا۔ فوراً جس طرح بن پڑا رتھ بہلی ڈولی جو سواری میسر ہوئی۔ دروازے پر لا کر کھڑی کی۔ گھر میں دو ہی عورتیں تھیں۔ ما اور نانی۔ تیسرا آپ۔ نانی کے حواس کچھ تو بڑھاپے نے کھوئے تھے کچھ اس آفت کے تصور کی نذر ہوئے۔ وہ کیا کرتیں۔ البتہ ما کسی قدر حواس میں تھیں۔ نظیر اور انھوں نے دونوں نے مل کر سارا اسباب سمیٹا۔ اور سواریوں پر ٹھکانے سے رکھا۔ گھر تھا تو خالی یہی تین تو ہوں گے نہیں۔ آخر لونڈیاں باندیاں نوکر چاکر بھی ہوں گے۔ چلنے لگے تو اچھا خاصا دس بارہ آدمیوں کا قافلہ تھا۔ یہ قافلہ آگرے کو روانہ ہوا۔ اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی کہ آگرے کو کیوں اختیار کیا گیا۔ شاید کوئی قرابت مند پہلے سے وہاں ہوں۔ یا یہ خیال ہو کہ دہلی کے بعد اس سے بہتر ان دنوں کوئی شہر محفوظ و معمور نہ تھا۔ بہر حال کوئی سبب ہو۔ یہ لوگ بجناح استعجال آگرے پہنچے اور وہاں مٹھائی کے پل پر قیام کیا۔

نظیر کی شادی

جب تک ہندوستان میں دُرانی کے قدم رہے کس کی شامت آئی تھی کہ شادی کا نام لیتا۔ تمام ملک میں ایک زلزلہ مچا ہوا تھا اور ہر طرف بے امنی پھیلی ہوئی تھی۔ آنے کو نظیر آگرے سے آیا مگر اُس آفت نے اُس کا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ آگرے کے قریب تک یہ بلا پہنچ چکی تھی۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ اُس کے لشکر میں وبا پھیلی جس کی وجہ سے کچھ یوں ہی سا لوٹ کر جاٹوں کے ملک کو متھرا کے ایک مذہبی میلے میں کئی ہزار جوگیوں سناسیوں اور دوسرے ہنود کی بھینٹ لیتا ہوا اوپر ہی اوپر اپنی ولایت کو لوٹ گیا۔

آدمی کی یہ بھی فطرت ہی کہ خطرہ اگرچہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو مگر جب وہ ٹل گیا تو پھر ایسا بے فکر ہو جاتا ہی گویا کبھی وہ خطرہ تھا ہی نہیں۔ طرفہ یہ ہی کہ جس قدر خطرہ بڑا ہوتا ہی اُسی قدر زیادہ زور سے طبیعت انسانی کا یہ خاصّہ ظاہر ہوتا ہی۔

دُرانی کے حملے سے دلوں میں جو پریشانیاں پیدا ہوئی تھیں وہ انتہائی درجے کی تھیں۔ مایوسی کا یہ حال تھا کہ کم ہی اشخاص ایسے ہوں گے جو یہ نہ سمجھتے ہوں کہ ہم پر حضرت عزرائیل کا آٹھوں پہر سخت پہرا ہی۔ عالمِ تردّد میں جب نفس تنگی کرنے لگتا تھا تو بعض اوقات خود اپنا جسم قبر بنکر فشار دیتا تھا۔ تنہا مکان میں بیٹھے ہوئے ہیں بیٹھے بیٹھے آنکھوں کے تلے یکایک اندھیرا چھا گیا۔ کانوں کو نکیرین کی آہٹ سُنائی دینے لگی۔ سوالات کا تار بندھا ہوا ہی۔ اور یہ ایک دو روز کی کیفیت نہ تھی۔ بلکہ مہینوں کا مشغلہ۔

مقامِ غور ہی کہ جب اِن مصیبت مندوں کے سر سے وہ بلا ٹلی ہو گی تو پھر اُن کے دلوں میں خیالاتِ

شکر کس زور سے ابھرے ہوں گے۔ کتنے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوں گے اور کتنے سر سجدے میں جھکے ہوں گے کتنی چادریں کن کن مزاروں پر چڑھی ہوں گی اور کتنی منتیں کہاں کہاں اتری ہوں گی۔

لیکن کیا اس صدمۂ عظیم کی تلافی کے لیے یہی معمولی رسمی باتیں کافی ہو سکتی ہیں۔ ہرگز نہیں۔ نیچر جو اپنے وقت کا ابن سینا ہی اپنا قانون لے کر آتا ہی اور غفلت کی معجون کھلا کر گزشتہ ہولناک واقعات کو دلوں سے یک قلم بھلا دیتا ہی۔ طفلانہ خوشیاں اور امنگیں آن بھرتی ہیں اور بے فکریوں کے مشغلے ہر طرف کثرت سے پھیل جاتے ہیں۔

نظیر کے گھر میں زیادہ تر عورتیں تھیں کچھ تو ان کی جبلت میں بزدلی کچھ سن کا تقاضا۔ درانی کے خوف سے جس قدر ان کے دل چور رہوے تھے شاید کم کسی کے ہوے ہوں گے۔ تعجب ہی کہ اس اتنی مدت تک زندہ کیوں کر رہیں۔ بہرحال جب اس مصیبت کو جھیل گئیں تو اب تو خدا نے اچھے دن دکھائے ابتدائی مراتبِ شکر وسپاس سے فراغت حاصل کر کے سب سے پہلے ان کے خیالات نظیر کی شادی کی طرف رجوع ہوئے نظیر جوان ہوا۔ تنہا گھبراتا ہوگا۔ کوئی دلھن سلیقے کی مل جاتی تو اس کا دل بہلتا لڑکے کی خبرگیری کچھ مردوں ہی سے خوب ہوتی ہی۔ ہم کیا جان سکتے ہیں کہ کہاں جاتا ہی کہاں آتا ہی شہر کا واسطہ ہی۔ ہر طرح کی صحبت ہی۔ خدا جانے کس صحبت میں بیٹھ کر کیا ڈھنگ اختیار کرے۔ اس کے ابا یہاں ہوتے تو اس کو روکتے ٹوکتے۔ ہم پردے کی عورتیں کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ پرایا شہر ہی۔ اس میں ہم کو کون جانتا ہی ہم کو کون بیٹی دے گا۔

نظیر جب سے آگرے میں آیا تھا۔ ابتدا میں تو یہ بھی تردودات میں مبتلا رہا۔ نیا شہر تھا۔ دنیا کا بہت زیادہ تجربہ اس کو نہ تھا۔ تمام انتظام نئے کرنے تھے۔ مکان کا نیا بندوبست۔ فرش فروش کا نیا بندوبست۔ پانی کے

لیے نیا سقا۔ کپڑوں کے لیے نیا دھوبی۔ خلاصہ یہ کہ خانہ داری کے تمام جزئیات وکلیات اُمور کا از سر نو انتظام۔ اِن جھگڑوں سے جب فراغت ہوئی تو رفتہ رفتہ اس نے کام کے لوگوں سے تعارف پیدا کرنا شروع کیا۔ کچھ تعارف تو انتظامِ خانہ داری کے ضمن میں بھی ہوا تھا مگر اُس میں کچھ اُس کے مذاقِ خاص کو دخل نہ تھا۔ اب یہ ایسے لوگوں سے تعارف پیدا کرنے لگا جن میں اس کی دل بستگی اور پسند کے لائق صفتیں موجود تھیں۔ کہیں سُنا کہ فلاں نوجوان نہایت ذہین اور طبیعت کا چالاک ہے۔ اُستاد اُس کے مدّاح ہیں اور شہر میں اُس کی بڑی تعریف ہے۔ فوراً کسی تقریب سے اُس سے جا ملا اور رسمِ آشنائی بڑھا کر مبادلۂ خیالات کرنے لگا۔ ہر چند ایک ذکی دوسرے ذکی اور ایک طبّاع دوسرے طبّاع کا جلد قائل نہیں ہوتا مگر غیر معمولی طبّاعی و ذکاوت کا کوئی کب تک انکار کرسکتا ہے۔ انصاف پسندی غالب آتی ہے اور نظیر کی اذکیا کی انجمن میں بھی اذکیا کی زبان سے تعریف ہوتی ہے۔

اُن دنوں اظہارِ جودت کا ایک بہت بڑا موقع مشاعرہ تھا۔ میر تقی کی شاعری اوج پر تھی۔ تمام شہر اُن کا لوہا مانتا تھا۔ جس مشاعرے میں یہ شریک ہوتے اُس کا مہینوں تذکرہ رہتا۔ اکثر سخن فہم اور سخن سنج اُن کا نام سُن کر بشوق شریک ہوتے اور محظوظ واپس آتے۔ شرکاءِ مشاعرہ کے رنگین اور چیدہ اشعار ہر ایک کی زبان پر ہوتے۔

نظیر دہلی سے آیا تھا تو شعر کہتا ہوا آیا تھا۔ جوانی عاشقی کا گہرا رنگ اُس کے مزاج میں کھبر رہی تھی۔ طبیعت کی شوخی ہر وقت ایک تازہ گلدستہ سامنے لیے رہتی تھی۔ پہلے تو دو ایک دفعہ یوں ہی شریکِ مشاعرہ ہوا جب اپنے ہم عمر سخن گویوں کا رنگ ڈھنگ دیکھ لیا تو ایک دفعہ خود اس کے دل میں یہی خیال پیدا ہوا کہ لاؤ اب کے میں بھی تو کچھ لکھوں۔ اور لوگ لکھتے تھے تو اساتذہ کی تقلید کرتے تھے بڑی فکر سے لکھتے۔

ہفتوں میں غزل تمام کرتے۔ پھر اُستاد کے حضور لے جاتے۔ اُستاد کچھ شعر کاٹتے کچھ چھانٹتے۔ کسی شعر کی اصلاح فرماتے۔ بعض مُنھ چڑھے شاگرد کو دو ایک شعر اپنے خزانۂ طبیعت سے بھی عطا کرتے۔ گو اس ترکیب سے معمولی واہ واہ سبحان اللہ سے اُن کے کان آشنا ہو جاتے تھے مگر کوئی غیر معمولی چرچا نہیں پھیلتا تھا۔ نظیر اپنا اُستاد آپ تھا۔ ہر چند تھوڑی بہت تقلید سے تو چارہ نہ تھا مگر طبیعت کی آزادی اور شوخی زیادہ تر اپنی طرف کھینچ کرلے جاتی تھی جس سے قوتِ ایجاد کو پھولنے پھلنے کا اچھا موقع ہاتھ آتا تھا۔ اسی عالم میں اُس نے ایک شگفتہ اور لطیف غزل طیار کی۔ امتحاناً کسی دلی دوست کو سُنائی تو وہ مُصر ہوئے کہ اس کو اب کے مشاعرے میں پڑھو اور ضرور پڑھو۔ تقریب کا میرا ذمہ۔ نظیر اُس دوست کی صلاح پہلے تو انکسار سے نہیں مانتا مگر خودنمائی دامن نہیں چھوڑتی بقولِ غنیمت ؎ پری رو تابِ مستوری ندارد ٭ چو در بندی سر از روزن بر آرد ٭ آخر جا تا ہی۔ نظیر کو آئے ہوئے اتنا زمانہ ہو گیا تھا کہ کسی طرح میر صاحب تک بھی اس کا تذکرہ پہنچ گیا تھا۔ جب اس کی غزل کی تقریب کی گئی میر صاحب نے اپنے مقدّس لبوں سے اظہارِ تبسم فرما کر ایک مُربیانہ ادا سے یوں ارشاد کیا۔ ہاں بھئی۔ پڑھو اور ضرور پڑھو۔ کُلّ جدید لذیذ دلی کے چٹخارے تو مشہور ہیں۔

دل کی دُھکڑ پکڑ اُس وقت قابلِ ملاحظہ تھی۔ مگر تقریب ہو چکی تھی۔ اتنا بڑا اُستاد شوق ظاہر کر چکا تھا پھر سوا پڑھنے کے چارہ کیا تھا۔ دل کو کڑا کر کے بند سے غزل کھولی۔ اور ہاتھ میں ورق کو مضبوطی سے تھام کر ایک نیم محجوب ادا سے لوگوں کی طرف مخاطب ہوا۔ چاروں طرف سے ارشاد ارشاد کا غُل تھا جس وقت نظیر نے یہ مطلع پڑھا ہی لوگوں کا عجب عالم تھا۔

نظیر بڑا اِک بتِ پری وش نئی سج دھج نئی ادا کا
جو عُمر دیکھو تو دس برس کی پہ قہر آفت غضب خدا کا

ختمِ غزل پر میر صاحب نے قریب بُلا کر پیٹھ ٹھونکی اور مکرر فرمایا عُمرت دراز باد۔

جس مشاعرے کا یہ ذکر ہے اس میں گو میر صاحب نے بھی غزل پڑھی لوگوں کے دلوں میں نظیر کے اشعار نے تعجب کے خیالات اس کثرت سے بھر دیے تھے کہ کسی اور بات کی گنجائش ہی نہ تھی رنگ جمتا تو کیوں کر جمتا۔ اُن دنوں کے حافظے دفتر کے دفتر یاد رکھ سکتے تھے مگر ساتھ اس کے بھی بنظر مزید احتیاط کئی نقلیں لوگوں نے وہیں لیں اور کئی نظیر کے گھر پر آکر لے گئے۔ نظیر اپنی اس کامیابی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ جدھر جاتا تھا لوگوں سے داد پاتا تھا۔ جوان مرحبا اور حبذا کہتے تھے اور بوڑھے ماشاء اللہ چشم بددور فرماتے تھے۔ شدہ شدہ اُس کی شہرت ملکوں کی گلی میں بھی پہنچی۔ وہاں ایک دہلی کے بادشاہی احدی رہتے تھے۔ اُن کا نام تو معلوم نہیں اور چنداں اُس سے غرض بھی نہیں مگر اُن کے ایک داماد تھے جن کا نام محمد رحمٰن تھا۔ احدی صاحب کی چوں کہ اللہ آمیں کی ایک ہی بیٹی تھی اپنے داماد کو بہت چاہتے تھے۔ گویا ایک طور پر اُن کو خانہ داماد کر لیا تھا۔ اُن کے دو لڑکے تھے خیرالدین اور کریم الدین اور ایک لڑکی جس کا نام معلوم نہیں۔ یہ لڑکی اب اُس عمر کو پہنچی تھی جس میں بزرگوں خصوصاً بزرگ عورتوں کو بڑی فکر ہوتی ہے۔ خانہ دامادی کے سبب باپ تو بے فکری کے ساتھ دونوں وقت کھاتے اور روند ناتے تھے مگر ماں اور نانی کو نیند نہ آتی تھی۔ احدی صاحب پر ہر حیلے بہانے سے تقاضے ہوتے کہ اس کی شادی کی فکر کرو۔ وہ بھی کہتے مجھے خیال ہے۔ فکر ہی میں ہوں کوئی ڈھب کا پیام آئے تو کہوں۔ اسی اثنا میں نظیر کی طباعیوں کا حال سنا۔ کسی موقع پر جب وہ تاج بی بی کے روضے کی سیر کو باغ میں آیا تھا تو اُس کو دیکھا بھی تھا۔ احدی صاحب کے دل میں بڑے زور سے خیال آیا کہ ہم بھی دہلی کے ہیں اور اس لڑکے کا خاندان بھی دہلی کا ہے۔ کیا خوب ہوتا کہ یہ لڑکا ہم کو ملتا۔ شہر میں مشاطوں کی کیا کمی ہے۔ ایک کو بلاؤ دس دوڑی آئیں۔ احدی صاحب نے کسی مشہور مشاطہ کو بلایا اور اُس سے اپنا عندیہ بیان کیا۔ اُس نے کہا آپ فکر نہ کیجیے۔ یہ تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دو ہی چار روز کا ذکر ہے کہ خود لڑکے کی

ماں نے مجھ کو بلا کر بڑی منت اور ساجت سے کہا تھا اچھی کوئی لڑکی میرے ولی محمد کے لیے نہیں ٹھہرا دیتیں۔

مشاطہ احدی صاحب کے ہاں سے چل کر نظیر کے گھر آتی ہے اور یہاں اُس کی ماتالی پاس اپنا رنگ جماتی ہے دولہن کی صورت کی تعریف کرتی ہے۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ ہنر سلیقے کی بڑائی ہانکتی ہے۔ دسوں اُنگلیاں دسوں چراغ۔ حسب نسب کی خوبیاں جتاتی ہے۔ اِن کے بزرگوں میں بڑے بڑے لوگ ہو گزرے ہیں۔ ملکوں کی گلی اُنھی کی آبادی ہوئی ہے۔ پہلے اِن لوگوں کا بڑا دور دورہ تھا۔ قوم کے مغل تو ہیں ہی اور مغل بھی کون چغتائی۔ اِن کی جواں مردی میں شک کس کو ہو سکتا ہے۔ ملک میں لڑائی تھی۔ بادشاہ حیران تھے۔ کوئی تدبیر بن نہ پڑتی تھی۔ آخر لوگوں نے نام تو یاد نہیں مگر اُن کے پرکھوں میں جو سب سے بڑے ہو گزرے ہیں اُن کا نام لیا۔ چھوٹتے ہی بلوائے گئے اور لڑائی پر روانہ ہوئے۔ کُل جمع اِن کے ساتھ دو سو سپاہی تھے اور غنیم کی طرف خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کم سے کم دو لاکھ۔ مگر اُن کی بہادری اور جرأت کے صدقے جائیے کہ دو گھنٹے میں پھر ایک کا بھی کہیں پتا نہ تھا۔ سچ ہے تلوار کی آنچ ایسی ہی ہوتی ہے غرض اُسی دن سے اُن کو بادشاہ نے تمام فوج کا سردار کیا۔ اور یہ سپہ سالار کے نام سے مشہور ہوئے۔ مگر بیوی دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ اور نوکری موت کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ عروج دیکھ کر لوگ جلنے لگے۔ درباریوں نے بادشاہ کے کان بھرے۔ بادشاہ تھے ذرا کانوں کے کچے۔ دم میں آگئے۔ حاکم کا قہر اور گنگا کی لہر مشہور بات ہے فوراً حکم ہو گیا کہ کل صبح تک شہر چھوڑ دو نہیں بال بچے سب کولو میں پلوا دیے جائیں گے۔ اِس حکم کے بعد کھانا پینا کس کو خوش آسکتا تھا۔ راتوں رات وہاں سے روانہ ہوئے اور آگرے ہی میں آکر دم لیا۔ اُسی زمانے سے پرانی منڈی میں باغ خان عالم کے قریب ملکوں کی گلی میں آباد ہیں۔ پہلے تو بہت کچھ تھا مگر بس گئے گزرے

وقت میں بھی کسی کے محتاج نہیں۔ دن کو دے کر کھاتے ہیں اور شہر میں ان کی بڑی آب ہے وغیرہ۔

اِس طرح کی باتوں سے نظیر کی ماں نانی کو وہ ایک آن میں شیشے میں اُتار کر قول قرار لے کر پھر ملکوں کی گلی واپس جاتی ہے اور ہنستی ہوئی بڑے دعوے کے ساتھ انعام کا تقاضا کرتی ہے۔ سب آؤ بھگت سے اُس کو اُونچی پیڑھی پر بٹھاتی ہیں اور پان پہ پان اور زردے پر زردہ دیے جاتی ہیں۔ بی مشاطہ پھر اصل پیام سُناتی ہیں۔ اور ہنسی خوشی گھی شکر سے اُن کا مُنھ بھرا جاتا ہے۔

ابتدائی اُمور کے بعد پھر ضابطے کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔ نظیر کے گھر کی عورتیں نظیر کو اپنے ارادے سے مطّلع کرتی ہیں۔ وہ ایک خوش آیند ادا سے مسکرا کر شرماتا ہوا جواب دیتا ہے۔ جیسی آپ لوگوں کی خوشی۔ اس رضامندی کے متعلق پیشین گوئی کرنے والیاں داد لینے کو اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ کیوں بیوی میں نہ کہتی تھی صاحب زادے آپ کے حکم سے باہر نہ ہوں گے۔ پھر کسی دن نظیر کو رقعے کی تکلیف دی جاتی ہے۔ گو اُس پہ جبر گزرتا ہے مگر کسی طرح اپنے حسب ونسب کا رجز سُنا کر رہتا ہے۔ ملکوں کی گلی میں تو ناموں کی ایک لمبی فہرست گِنی ہوگی مگر مجھے اُن میں سے صرف دو ہی معلوم ہوئے۔ ایں ہم غنیمت ست۔ وہ دو یہ ہیں۔ محمد فاروق۔ اور محمد سُلطان۔

رقعے کے بعد سخن ہارنے کی باری آئی۔ نوری دروازے سے نظیر کی ماں اور نانی دو ایک اُور پاس پڑوس کی عورتوں کو لے کر احدی صاحب کے گھر پہنچیں اور تجاہلِ عارفانہ کے ساتھ سخن ہار آئیں۔ اس لڑکی کو میں لوں گی۔ میں تم سے اس لڑکی کو مانگتی ہوں۔ یہ لڑکی تم مجھے دو۔ بقول شخصے من بھاوے مُنڈیا ہلاوے۔ اُدھر سے بھی کچھ عاجزی انکساری کے کلمات کے ساتھ کہ ہم تمھارے لائق تو نہیں ہیں۔ اس لڑکی میں کیا ہے جس پہ تم ریجھی ہو۔ اظہارِ رضامندی کیا گیا۔ اور آخر تاریخ منگنی کی مقرر ہو گئی۔

منگنی کے ایک ہفتہ قبل سے راگ رنگ شروع ہوا۔ نظیر کے گھر میں الگ اور نظیر کی منگیتر کے گھر میں الگ۔ اگر اِدھر گھوڑیاں گائی جاتی تھیں تو اُدھر سہاگ۔ یوں منگنی کی خبر گھوڑیوں پر سوار ہو کر بڑے سہاگ سے نکلی اور گھر پہنچی۔

خیر سے وہ منگنی کی سبھ گھڑی نیک ساعت بھی آہی پہنچی۔ نظیر رنگین لباس پہن کر دولھا بنتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لباس سے زیادہ آج کچھ اُن کی طبیعت رنگین ہو رہی ہے۔ اپنے احباب اور مستورات کے ساتھ خوش خوش دُلھن کے گھر تشریف لے جاتے ہیں۔ اور اندر باہر خوشی کا باغ لگا دیتے ہیں۔ عورتوں کے سواری سے اُترتے ہی چڑھاوے کے سامان گھر میں پھیل جاتے ہیں۔ سونے چاندی کے زیور۔ گوٹے ٹھپے اور پھولوں کے گہنے۔ دُہری دُہری انگوٹھیاں۔ مصری کے کوزے۔ خوش نما سنگاردان۔ اُن میں سونے چاندی کے ورق سے مڑھی ہوئی پان کی بیڑیاں۔ دُلھن کے ہاتھ پر رکھنے کے لیے رُومالوں میں بندھے ہوئے روپے اشرفیاں گود میں ڈالنے کے لیے ناریل کھیلیں بتاسے لڈو۔ مٹکیوں میں بھری بھری کئی من شیرینی۔

اس سامان کے ساتھ گھر میں ایک خاص خوشی پھیل جاتی ہے۔ اب جس شخص کو دیکھیے اُس کی پیشانی ایک خاص روشنی سے چمکی ہوئی ہے۔ دلی اُمنگوں نے ہاتھ پاؤں میں بھی پھرتیاں بھر دی ہیں۔ کوئی لپک کر اِدھر آتی ہے کوئی جھپٹ کر اُدھر جاتی ہے۔ زنان خانے کی پُرانی دنیا میں نئی دنیا کی ہل چل ہے۔ اسی دنیا میں ایک نئی نویلی رنگیلی البیلی کسی گوشے میں بیٹھی ہے۔ لوگوں کی ہر آہٹ اُس کے دل پر بجلی کی لہریں پیدا کر رہی ہے۔ دل کیا ہے خاصہ لیڈن جار ہے۔ دور کی آہٹ رفتہ رفتہ ایک ممتاز چاپ ہو جاتی ہے۔ سگھڑ سہاگنوں کا ایک خوش نما جھنڈا اندر داخل ہوتا ہے۔ سُرخ جوڑے سے شفق پھولتی ہے۔ گوٹے ٹھپے سے بجلیاں چمکتی ہیں۔ زیورات سے تارے چھٹک جاتے ہیں۔ غرض ایک سادی خوزادی آرایش و زیبایش کے طلسم سے خاصی دُلھن بن جاتی ہے۔

سمدھنیں آنکھیں بچھائے باہر بیٹھی ہیں۔ دلھن کی عمر ہی کیا ہی پھول ہو رہی ہی۔ اس خوش بو پھول کو لوگ گود میں اُٹھا کر سمدھنوں کی گود میں لا رکھتے ہیں۔ سمدھنیں اور کون نظیر کی ماں اور نانی۔ یہ دونوں رنگ ڈھنگ دیکھ کر جامے میں پھولی نہیں سماتیں۔ دلوں سے خوشی کی اُبل چھک کر لبوں پر آ بیٹھتی ہی۔ اور "شادی مبارک" کا مبارک راگ بلند کرتی ہی۔ جہیز کے زیوروں پر چڑھاوے کے زیور تاروں بھری رات میں جگنو چمکاتے ہیں۔ شیریں لبوں کو مصری قندِ مکرر بناتی ہی۔ بیڑہ زمرد سے لعل نکالتا ہی۔ ناریل کھیلیں تباسے لڈو بھری ہوئی گود میں حلوائی کی دکان کھول دیتے ہیں۔

گود بھری جا چکی تو گھونگھٹ کی گھٹا دور ہوئی۔ منہ چاند سا نکل آیا۔ آنکھیں ایک خاص ادا سے مندی ہیں چہرے پر اچھی خاصی تمتماہٹ ہی۔ بھولا پن رنگ لا رہا ہی۔ نیک بختوں کا بلائیں لینے کو جی چاہتا ہی۔ دلوں سے دعائیں نکل رہی ہیں۔ اُنگلیاں خیال کی پنج رہی ہیں۔ دونوں ہاتھوں میں رومال سے کھول کر روپے اور اشرفیاں رکھی جاتی ہیں۔ دہنے ہاتھ میں انگوٹھیوں کی بہار نظر آتی ہی۔ صدقے میں میراثنیں بھی کچھ پا جاتی ہیں۔ کہیں وہ نازک پھول کمُلا نہ جاے اِس خیال سے اُس کو گود میں اُٹھا کر پھر کوٹھری میں رکھ آتی ہیں عطر کی شیشیاں دل کھول کر اخلاق کرتی ہیں۔ پھولوں کے ہار گلے کا ہار ہوتے ہیں۔ شربت منہ میٹھا کرتا ہی۔ نقدی شکریہ ادا کرتی ہی۔ پھر اخیر میں چھالیا الایچی رخصت کے پان دیتی ہی۔

اندر کا حال تو سن چکے۔ اب باہر کا حال سنیے۔ برادری برابری مشہور بات ہی۔ جب دلھن کو چڑھاوا گیا تو کیا دولھا کو نہ جاتا۔ نظیر بے چارہ مسافرت میں تھا۔ ہر چند اُس کی ماں نانی دہلی کا ہنر سلیقہ رکھتی تھیں مگر بے سروسامانی میں کیا کر سکتی تھیں۔ دلھن کے نانا شہر کے رئیس تھے۔ قدیم گھرانا تھا۔ وافر آمدنی تھی۔ سب طرح کا اطمینان رکھتے تھے۔ بیگم صاحب بھی دل کی سخی تھیں۔ بڑے حوصلے سے دولھا کا چڑھاوا بھیجا۔

گوٹے اور پھولوں کے گہنے ایسے تھے کہ سب بے اختیار درود پڑھنے لگے۔ آنکھوں میں روشنی آئی۔ دماغ نے تازگی پائی۔ دوشالہ خاص کشمیر کا۔ ملاست میں ملائی نرمی میں ریشم۔ نقش و نگار میں قلم کا رچھینٹ۔ رومال عدد میں طاق۔ روئے حور کو کچھ مال نہ سمجھیں۔ تارِ زلف کو اگر کچھ سمجھیں تو چرخے کی بال سمجھیں۔ مردوں کو زیورات سے کیا کام۔ مگر نوشے کا ہاتھ خالی دیکھا نہیں جاتا۔ انگوٹھے کے لیے چاپ انگشتانہ ہے۔ چھوٹی انگلی کے لیے ایک مختصر سی انگشتری۔

نظیر نے گوٹے اور پھولوں کے گہنے تو بیٹھے ہی بیٹھے پہنے۔ جب دوشالے کی باری آئی تو کھڑا ہونا پڑا۔ شگفتہ مزاجی کی صبح میں سہانی شفق پھولی۔ چاپ انگشتانے نے دہنے ہاتھ کے انگوٹھے کو دل میں بٹھایا اِس خیال سے کہ نوشاہِ بلاغت کا چاؤش تھا۔ انگشتری نے چھوٹی انگلی کو آنکھوں میں جگہ دی اِس نظر سے کہ نو عروسِ فصاحت کی سہیلی تھی۔ رومال نے ہاتھ میں لالہ زار کھلایا۔ نقدی نے نثار ہو کر گلِ اشرفی کی بہار دکھائی۔ تبسم کی شاخ سے سلام کے پھول برسنے لگے۔ پھر عطر کی خوش بو پھیلی۔ پان کا رنگ جما۔ شربت کے مزے ہوئے۔ چلیے۔ منگنی ہو گئی۔ مبارک۔ سلامت۔ مگر اب تو رسموں کا تار بندھا۔ منگنی کے دوسرے ہی دن ملکول کی گلی سے عورتیں چوبا لے کر مٹھائی کے پل پر جاتی ہیں۔ سامان کچھ اس قسم کے ہیں:۔

چوبے۔ پھولوں کے زیور۔ رومال۔ چاندی سونے کے ورقوں میں لپٹی ہوئی بیڑیاں۔ ایک چاندی کا کٹورا۔ کسی قدر شکر۔ مونگ۔ اور چانول کا بھوڑا۔

عورتیں ادھر گھر میں اتریں۔ ادھر نظیر کو بلوا گیا۔ پیار کے ہاتھوں سے مسکرا مسکرا کر چھ نوالے کھلائے گئے۔ ساتویں نوالے پر بڑی ہنسی ہوئی۔ چوبے کے بعد چاندی کے کٹورے میں ٹونوں کا شربت آیا اور پلایا گیا۔ پھر پانوں کے بیڑے اور زر و مال ہاتھ پر رکھ دیے گئے۔ نظیر کی بہنیں کہاں تھیں کہ سوانگ بنتیں۔

اور اُس کے مُنھ میں بیڑا رکھتیں۔ خود سے کھا لیتا ہے اور پھر سب کو جھک جھک کر سلام کرتا ہے۔ سلام سے خوش ہو کر عورتیں کچھ نچھاور کرتی ہیں۔ میراثنیں اور کرکینیں مُنھ مانگی مُراد پاتی ہیں۔

احدی صاحب کی طرف تو لوگوں کے دلوں میں شدّت سے ارمان بھرے ہوئے تھے۔ اُن کو اُن کے طور پر چھوڑ دیا جاتا تو شاید چاؤ نکالنے کے لیے برس دو برس بھی شادی کا مذکور نہ کرتے۔ مگر نظیر کی طرف جلدی تھی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ مسافرت کا عالم تھا۔ اُن کے پاس وہ سامان نہ تھا کہ ہر تقریب میں سو دو سو خرچ کرتے۔ دوسرے نظیر اچھی طرح جوان ہو چکا تھا۔ پرایا شہر تھا۔ کوئی مرد سر پر نہ تھا کہ دن رات اُس کے حالات کی نگرانی کرتا۔ ہر وقت خوف میں گزرتی تھی کہ کہیں بُری صحبتوں میں بیٹھ کر راہ سے بے راہ نہ ہو جائے۔ تیسرے کچھ یہ بھی مقصود تھا کہ جلدی بہو گھر آئے اور گھر آباد ہو۔ نظیر کی ماں شاید کچھ ٹھہر بھی جاتی۔ مگر اس کی نانی کہاں دم لینے دیتی تھیں۔ اُن کی زبان پر دن رات یہی کلمہ تھا کہ زندگی موت کا ٹھکانا نہیں۔ سانس آئی آئی نہ آئی۔ کل کی کس کو خبر ہے۔ دنیا میں بہت رہ چکی اور سب ارمان نکل چکے۔ اب صرف ایک آرزو رہ گئی ہے کہ ولی محمد پروان چڑھے اور اُس کے سر سہرا دیکھوں۔ اِسی مطلب کو وہ دن میں سو طرح سے ادا کرتی تھیں اور سب کا خلاصہ یہ ہوتا تھا کہ جو ہو آج ہی ہو جائے۔

غرض منگنی کے ساتھ ساعت رکھنے کی دھوم ہوئی۔ کسی مسجد میں چانولوں کے طشت میں کچھ نقدی رکھی گئی۔ قرآنِ مجید کھولا گیا۔ پھر قرآن کو گرداں کے تاریخ مقرّرہ کا اعلان کر دیا گیا۔ مسجد کے مُلّا نے طشت کا جائزہ لیا۔ حاضرین پان کا بیڑا اور بتاشے لے کر رخصت ہوئے۔ گڑ اندر بھیجا گیا۔

شام کو اُدھر دونوں طرف سے زردہ پکوا کر بانٹا گیا۔ اُدھر عورتیں شیرینی اور میوہ لے کر دولھا اور دولھن دونوں کے گھروں میں سواریوں پر سے اُترنے لگیں۔ ڈھولک نے میٹھے بولوں سے اُن کا خیر مقدم

کیا۔ اُنھوں نے خوشی میں آکر سُریلی تانیں گوشِ زُہرہ تک پہنچائیں۔ اور اب ساچق کے روز تک یہی معمول ہوا کہ روز آتیں اور گا بجا کر پھر اپنے اپنے گھر چلی جاتیں۔

جب نکاح کو صرف سات روز رہ گئے تو دولھا دُلھن دونوں مائیوں بٹھائے گئے۔ دولھا کا مائیوں بیٹھنا کچھ اُس کی ماں اور نانی ہی کو خوش آیا ہوگا۔ لیکن سچ پوچھیے تو مائیوں بیٹھنا تھا دُلھن کا جس کا تصور ہمیں آج بھی خوش کر رہا ہے۔ اُن دنوں فوٹو کا رواج نہ تھا۔ مُصوّر گھر میں گھُسنے نہ پاتے تھے۔ فقط خیال کہاں تک نقاشی کرے۔ پھر بھی کچھ خوش نما خط و خال ہمیں دور سے نظر آتے ہیں۔ شباب طفلی پر جھکا پڑتا ہے۔ طفلی شباب کو پرے دھکیل رہی ہے۔ ولایتی خون چھپی رنگت پر شہاب چھڑک رہا ہے۔ مخموریت آنکھوں میں گلابی جھلکا رہی ہے۔ مسکراہٹ گالوں میں گڑھے ڈال کر گلاب کو کٹورے جھنکواتی ہے۔ ٹھوڑی اپنی نکیلی ترکیب سے سیب کے دل میں اُتری چلی جاتی ہے۔ بھنورا سے کالے کالے چکیلے چٹکیلے ریشم کے لچّھے سر سے اُلجھتے سُلجھتے بکھرتے لہراتے پتلی لچکیلی کمر سے بالشت دو بالشت نیچے تک پانو پھیلاتے ہیں۔ ہم اس خوش نما تصویر کو بسنتی جوڑا پنھا کر کچھ نیک بختوں کے جھرمٹ میں ایک نائن کے ہاتھ میں چھوڑتے ہیں۔ اب وہ جانے اور اُس کا کام۔ میوے اور پنیڈیوں کے ناشتے اور دودھ کے چاے پانی میں ہم بھی شوق سے شریک ہو سکتے تھے مگر ادب اندر پانو کب رکھنے دیتا ہے۔ خیر رُخصت۔

دن جاتے کچھ دیر نہیں لگتی خصوصاً وہ دن جو خوشی کے ہیں۔ ان کو تو بجلی کے سے پر لگ جاتے ہیں ہم اس خیال میں پڑے سوتے تھے کہ ابھی پورے سات دن باقی ہیں مگر آنکھ جو کھلتی ہے تو دیکھتے ہیں نظیر کے گھر میں ساچق کے سامان ہو رہے ہیں۔ منتظمین سرگرم انتظام ہیں۔ قُلی مزدوروں کا ہجوم ہے۔ آرایش کے سامان پھیلے ہوئے ہیں مشعل اور آتش بازی کے ٹوکروں پر ایک صاحب لٹھ لیے ہوئے پہرہ دے رہے ہیں

باہر سڑک پر گھوڑے ہنہنا رہے ہیں۔ تخت رواں کے آس پاس کچھ بہشت کی قمریاں اٹھلا رہی ہیں۔ روشن چوکی اور تماشے والے اپنی دھن میں ہیں۔ صحن میں جہاں عمدہ نقش و نگار کی مٹکیاں رکھی ہوئی ہیں کوئی صاحب تشریف لائے اور ڈھکنوں کے کنول پر تپلی تپلی بتیاں چڑھا گئے۔ کسی طرف سے ایک خوش نما خوان چلا آتا ہے جس میں چار شیشے نقاشی کے کام کے ڈنڈیوں کے رنگ سے بھرے ہوئے اور کچھ شیشیاں تیل عطر وغیرہ کی رکھی ہوئی ہیں۔ منھ ان کا سلیقے سے گوٹے کے سرخ کپڑے سے بند ہے۔ علاوہ ان کے سر پر باندھنے کے لیے کلاوے۔ مہندی۔ سرمہ۔ مسی۔ تیل ڈالنے کی پیالیاں۔ کنگھیاں اور دو انگوٹھیاں بھی ہیں۔ ساتھ ہی اس کے دو سادی مٹکیاں چونے سے پتی ہوئی منھ کلاوے سے بندھا ہوا۔ اس پر آٹے کی مچھلیاں چپکی ہوئیں۔ دو چنچل چھبیلی کمر کولے کو مٹکاتی لا رہی ہیں۔ پوچھنے سے معلوم ہوا ایک میں گڑ کا گاڑھا شربت ہے اور دوسری میں دہی دیکھتے ہی دیکھتے وہ دیکھیے وہ چڑھاوے کے جوڑے کا خوان بھی پہنچ گیا۔ ایک جوڑا تو بہت ہی بڑی طیاری کا ہے اور سلا سلایا طیار ہے مگر دوسرے جوڑے نے ابھی مقراض اور سوئی سے ملاقات بھی نہیں کی۔ گیارہ گز سرخ تول ہے جس کو سہاگنیں سوہا کہتی ہیں اور پائجامے کے لیے سوا دو گز گلابی رنگ کی لین کلاٹ اور سبز گلبدن کا تھان جوڑے کے ساتھ زرنگار جوتی بھی ہے جس میں چاندی کے گھنگرو پڑے چھن چھن کر رہے ہیں اور وہ بیش بہا ازاربند بھی جس پر خود نظیر کا یہ شعر صادق ہے:۔

گوٹا کناری بادلہ مقیش کے سوا	تھے چار تولے موتی جو تولا ازاربند

اسی خوان میں وہ خوش نما لاٹ بھی قائم ہے جو ابرک پنی گوٹے پٹھے اور کلابتون کی وجہ سے بڑی جھلکار ہی ہے۔ لاٹ نہیں یہ واقع میں سہاگ کا طلسم ہے۔ تمام خوش بودار مصالح اس میں بھرے ہوئے ہیں۔ خود خوش بو گواہ ہے۔ جوتری۔ جائفل۔ زعفران۔ چھوٹی بڑی الائچی۔ جوڈھونڈو سب موجود۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے

کہ اس میں دلھن کے پہنے کی سونے کی نتھ بھی ہے جس میں ایک نہیں تین تین چمکیلے سڈول موتی پڑے پاک دامانی کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ سہاگ پڑا جو آپ نے سنا ہو وہ یہی ہے۔ کچھ معلوم نہیں مطلب کیا ہے مگر ایک نیک بخت ایک ٹوکرے میں سوے پالک کا ساگ بھی لا رہی ہے۔ لانے دو۔ میں نے نہیں دیکھا مگر لوگ کہتے ہیں کسی طرف دلھن کی گود بھرنے اور آراستگی کے لوازمات بھی ہیں۔ بہت مبارک۔

شہر میں مشہور ہے کہ آج نظیر کی ساچق نکلے گی۔ نوری دروازے سے خان عالم کے باغ تک دورویہ انتظار نے اپنی کھڑکیاں کھول رکھی ہیں۔ جب شام کی سیاہی کسی قدر خوش نما طور پر پھیلی تو منتظمین میں ایک خاص سرگرمی آئی اور اس سرگرمی کے ساتھ مزدوروں اور قلیوں اور اسی درجے کے اور لوگوں میں ایک خاص ہل چل پیدا ہوئی۔ بے جان چیزیں جو زمین پر پڑی تھیں وہ سروں پر پھرنے لگیں۔ مٹکیوں کے کنول آنکھوں کی طرح روشن ہوے۔ اور ستاروں کی طرح جگمگانے لگے۔ درہمی برہم ہوئی۔ انتظام نے نظام پایا۔ شکست خوردہ فوجیں سمٹ آئیں۔ ٹوٹی ہوئی صفیں جمنے لگیں۔ تلنگوں نے پرا باندھا۔ سواروں نے باگیں سنبھالیں۔ بہشتی قمریاں تخت رواں کے پنجرے میں ہو بیٹھیں۔ روشن چوکی پر راگنیوں کا جلوس ہوا۔ باجوں سے آسمان گونج اٹھا۔ مشعلیں ہر طرف شعلہ فشاں ہیں۔ ہوائیوں نے ستاروں کو چھیڑنا شروع کیا۔ دیپک مہتاب نے چاند سورج کو چار چاند لگائے۔ غبارے سیاروں کا خاکا اڑانے لگے۔ اناروں کے گل فشاں نورانی پیڑ قائم ہیں۔ جوہی کے منھ سے مسلسل پھول جھڑ رہے ہیں۔

غرض اس ٹھاٹھ اور طیاری سے نظیر کی ساچق روانہ ہوئی۔ تماشائیوں کے چہرے خوشی کے نور سے چمکنے لگے۔ راہ دیکھنے والی آنکھیں راہ کی طرح روشن ہوئیں۔ ہر چند برات نوری دروازے سے کہیں دور جا پہنچی ہے پھر بھی لوگ یہی کہتے ہیں کہ ابھی نوری دروازے سے باہر نہیں نکلی۔ نوری دروازہ ساتھ ہے اور شاید خان عالم کے

باغ میں اس کا بھی ملکوں کی گلی سے بیاہ ہونے والا ہے۔ خدا راس لائے

ملکوں کی گلی میں احدی صاحب کی ڈیوڑھی کے متصل تماشائیوں کے دل کچھ خاص کیفیت سے رنگے ہوئے ہیں۔ اُن کی نگاہیں سرسری طور پر روشن نہیں ہوتیں۔ اُن کی آنکھوں سے دل جھانک رہے ہیں اور اُنھی کھڑکیوں سے آرزوں کا قافلے کا قافلہ نکلا چلا آتا ہے۔

کچھ مُلّا اور واعظ کا گھر تو تھا نہیں کہ احتیاط کی جاتی۔ خاصی طرح کڑھا و چڑھایا گیا۔ اصلی یا بنی ہوئی سوہلیوں نے ایک ایک گلگلا اپنے ہاتھ سے چھوڑا۔ آٹے اور گڑ کے ساتھ اپنا اپنا ینگ لیا۔ ساتھ کے ساتھ میراثنوں نے اللہ میاں کی سلامتی پڑھی۔ اللہ میاں کے گیت سُنائے۔ پھر ایک کوری مٹکی آئی۔ شربت نے پیٹ بھر کر اس کی پیاس بجھائی۔ صندل نے مُنھ پر گلاب چھڑکا۔ ایک کلاوہ بندھی ہوئی بدھنی سہرا لٹکا کر سرتاج ہوئی۔ بدھنی کی ٹونٹی کے منھ میں سلامتی سے ایک پان کا بیڑا بھی دبا ہوا ہے۔ اللہ میاں کی سنجیری جو سُنا ہے وہ یہی ہے۔ گلگلے نہیں معلوم کس بات پر مُنھ پھلائے تھے۔ اللہ میاں کے رحم کو جوش آیا۔ چانول پسے اور مصری سے شیر و شکر ہوئے۔ گو اس لیپ سے گالوں کا ورم تو دفع نہیں ہوا مگر پیشانی پر رضامندی کی چمک ضرور ہے۔ اپنا تو لوا قسم وجہ اللہ کی تفسیر طباق کی محراب میں آٹے کا مُصلیٰ بچھائے ہوئے اللہ میاں کی جو کچھ بیان کر رہی ہے جس کی چرب زبانی اور روشن بیانی ابین من الامس و اظہر من الشمس ہے۔ خوش عقیدہ سہاگنیں غش ہیں۔ اگر مثنوی شریف کی وہ شباں والی حکایت ٹھیک ہے تو ید بیضا کا چراغ یہاں بھی نہیں جل سکتا۔ خوش عقیدگی نے آنکھوں سے نیند کو اُڑا دیا ہے۔ نیک بختیں ہنسی خوشی جاگ رہی ہیں۔ بھینی بھینی رات اُن کی مشک بو چوٹیوں اور معطر جوڑوں سے جاڑوں میں ہار سنگار کے جنگل کی چھانو ہو رہی ہے۔ لیجیے اب نور کا تڑکا ہوا۔ چراغ جھلا جھلا کر رخصت چلتے ہیں۔ ستاروں کی انجمن بھی گھبرا ہی جاتی ہے۔ حسینوں کے مُنھ چاند ہیں مگر صبح کے چاند کی طرح پھیکے اور ماند

شب بیداری رنگ لارہی ہے۔ کیا ہوا رنگ لاتی ہے تو لانے دو۔ کیا ایسے جاگتے نصیب روز آتے ہیں۔ مُلا صاحب باہر انتظار میں گھبرا رہے ہیں۔ کوئی نیک بخت ہو تو اُن کو بُلا لائے۔ نیاز کی چیزیں سب طیار ہیں۔ آئیں اور اللہ میاں کی سلامتی کی نیاز دے جائیں۔ لیجیے مُلا صاحب بھی آہی گئے۔ برزخِ مبارک قابلِ دید ہے۔ کیا ہی عقیدت سے ہاتھ پھیلائے ہوئے زیرِ لب بُڑبُڑا رہے ہیں۔ اپنا رنگ جمانے کے لیے خواہ مخواہ بھی دیر لگا رہے ہیں۔ اجی حضرت کہیں جلدی اُٹھو بھی۔ اب تو عورتیں بھی گھبرا اُٹھیں۔ بڑے تقاضوں سے یہ فتنہ اُٹھا تو سہی مگر کچھ پے کر اُٹھا۔ چراغی کا دینا تو شاید ناگوار نہ گزرا ہوگا مگر نہیں معلوم کیوں۔ چلتے وقت حضرت پر گالیوں کی بوچھاڑ خوب ہوئی۔

صبح سے دوپہر تک کچھ بہت زیادہ عرصہ نہ تھا۔ باتوں ہی باتوں میں گزر گیا۔ اب بی بی کے کھانے کی طیاری شروع ہوئی۔ چودہ طباقوں میں کھانا نکالا گیا۔ کورے برتن۔ سفید خشکہ۔ صاف دہی۔ شفاف شکر۔ شیریں میوہ۔ خوش بُو ہار۔ غرض ہر چیز پاک دامانی آشکار۔ بیوی زنیں جن کے حسب نسب میں کسی طرح کا فرق نہیں۔ جن کے چال چلن میں کسی قسم کا نقص نہیں۔ جن کے اخلاق بالکل شریفانہ۔ جن کی وفاداری و اطاعت ضرب المثل۔ حضرت بی بی کے ہاف روزے سے مُنھ کو نورانی کیے ہوئے خراماں خراماں آرہی ہیں۔ پیغمبر صاحب اور پیروں کے چار طباق الگ کیے گئے۔ بی بی کی صحنکیں ان نیک بختوں کے آگے رکھی گئیں۔ پہلے سنجیری کے شربت سے سبھوں نے روزہ کھولا۔ پھر کھانے میں شریک ہوئیں۔ کھانے کے بعد سرمہ۔ مہندی عطر کی باری آئی۔ مہندی کچھ تو ہاتھوں میں رچی۔ جو ہاتھوں سے بچی وہ گھُل کر اور طرح کام آئی۔ سادہ دلی رنگ لائی۔ بی بی کا کھانا ہوا اور بی بی کے گیت نہ گائے جائیں کوئی کہنے کی بات ہے۔ عقیدت کی آوازیں بلند ہیں۔ سُننے تو زہرہ بھی ریجھ جائے مگر آنے کی اجازت ہی نہیں۔

لوگوں کو یاد ہوگا دُلھن کے جوڑے کے ساتھ ساچق کے روز سوہے کے نام سے گیارہ گز سُرخ کپڑا بھی آیا تھا۔ اِس کپڑے کا نصف گز پہلے دُلھن کے گھر کی بیوی زنوں میں تقسیم ہوکر گزوں سرخ روئی حاصل کرتا ہے۔ مُبارک وہ چوٹیاں جن میں اس کا موباف ہو۔ پھر باقی کتر بیونت کرکے بیوی زنین اُسی وقت دُلھن کا سُوہا جوڑا سیتی ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد وہ منقّش شیشے جو ساچق کے دن سے بسنت کو بغل میں دبائے بیٹھے ہیں کھُلتے ہیں اور ایک ہی غوطے میں دُلھن کے جوڑے کو بسنتی کر دیتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے برات کی رات بھی آہی پہنچی۔ نظیر تو ساچق ہی کے دن سے سُسرال میں براج رہے ہیں چڑھاوا تو چڑھایا جا چُکا ہے۔ اب برات کے جوڑے پر نظر ہے۔ جوڑے کی تفصیل مُجھے معلوم نہیں۔ مگر اتنا دیکھتا ہوں کہ جوڑے کی کشتی ایک مکلّف خوان پوش سے ڈھکی ہوئی آرہی ہے۔ آگے آگے میراثنوں کا جُھرمٹ ہے۔ ٹونے دل موہ لے رہے ہیں۔ دُلھن کے مُنہ سے کچھ اس طرح کے میٹھے بول سُنائی دے رہے ہیں:

ہریالے بنے لاڈلے پر میں ایسا ٹونا بناؤں گی۔
جب دیکھے مُکھ میرا ہی دیکھے میں تو سنگ لگائے پھروں گی

برات کا جوڑا جا چُکا تو دُلھن کے والدِ بزرگوار اندر سے بُلائے گئے۔ ہر چند اِن کے دل میں بیٹی کی جدائی کے خیالات تلاطم پیدا کر رہے ہیں مگر مصنوعی استقلال رومال سے گردِ ملال چہرے سے دور کرتا جاتا ہے۔ پیاری بیٹی کی صورت دیکھ کر استقلال کی گرفت سُست ہو جاتی ہے اور رومال ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ دل اُمڈ آتا ہے اور آنکھیں بھر آتی ہیں۔ ہر چند گلے میں رقت سے پھندے پڑے ہوئے ہیں مگر ایک ضروری فرض سر سے اُتارنا ہے چُپ کیوں کر رہیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہاتھ پر روپے اور پیڑیاں رکھیں اور لرزتی ہوئی آواز سے یہ فقرہ آویزۂ گوش کیا:۔

ای لڑکی - بے آج میں تیرے فرض سے ادا ہوا -

قیامت کا فقرہ تھا - اس کے سننے کے بعد کسی کو یارائے ضبط نہ رہا - گرد و پیش جتنے تھے سب رو رہے تھے - باپ بیٹی کے رونے کو پھر کیا پوچھتے ہو - سچ تو یہ ہی بقولِ شاہ نصیر :-

یوں نہ برستے دیکھے ہوں گے بل کے کسی نے ساون بھادوں

عین خوشی میں یہ منظرِ رقت شاید بعض طبیعت کو کسی قدر بے موقع معلوم ہو مگر فطرت انسانی یوں ہی ہے اور اُس سے چشم پوشی نہیں کیجا سکتی -

ادھر تو یہ سماں تھا اُدھر نوشہ اور نوشہ کون میاں لطیر نہا دھو کپڑے بدل اچھے خاصے دولھا بن باہر تشریف لائے - طوائفوں نے شہانے کی دُھن میں سہرا گانا شروع کیا - گانا ہو ہی رہا تھا کہ مجتہد صاحب کے قدوم میمنت لزوم کی دھوم مچی -

تنہا نہیں ہوں یارو - با نالۂ و فغاں ہوں

مُجتہد صاحب کے ساتھ شاہدین بالغین حُریں بھی تشریف رکھتے ہیں - ہر چند مجتہد صاحب کی شان میں کوئی کلمہ عرض کرنا سوء ادب ہے مگر کچھ تو سمدھیانے کا تعلق کچھ حضرت کا بررُخِ مُبارک بے جبین کیے دیتا ہے - اور بے ساختہ پھبتی کہنے کو جی چاہتا ہے - اب چاہے سوء ادب ہو چاہے استخفافِ مذہب آئی پر چوکنا اپنے مذہب میں تو روا نہیں - سفید داڑھی اور نیلی پگڑی معلوم ہوتا ہے چرخ پیر نے رات کی پُرانی ساڑی سر سے لپیٹ لی ہے - آنکھیں زُہرہ مُشتری کی طرح چمک نہیں رہیں بلکہ لو لی فلک سے قاضی چرخ کی آنکھیں لڑ رہی ہیں - گو ماند ہے مگر پھر بھی پیشانی تئیسویں چوبیسویں کا چاند ہے - شک ہو تو یقین کے لیے گھٹّے کی جھائیاں موجود - ڈاڑھی چاہِ زقن سے حوضِ ناف تک کہکشاں کی طرح پھیلی ہوئی - دُم دار ستارے شرم کے مارے شاید اسی

کنوے یا حوض میں ڈوب مرنے۔ شدت نزلہ سے ناک دلوسے گوش بگوش ڈوب کر دیکھیے تو دلو بھی پانی بھرتا نظر آے۔ مونچھیں زہر تقویٰ میں بجھی ہوئی شیر گردوں کی مونچھیں اُکھاڑ رہی ہیں۔ بھنویں وہ زہر کی گانٹھ کہ عقرب فلک کو پڑی ڈنک مار رہی ہیں۔

شمائل شریف کے بیان میں اس سے زیادہ موشگافی مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ بعضوں کو تو اتنی بھی زہر معلوم دی ہوگی۔ لیکن شادی کا موقع ہے۔ اُمید ہے شربت کے گھونٹ کی طرح پی جائیں گے۔

آتے کے ساتھ پہلے تو سر نمبر بھاری بھر کم آواز سے سلام علیکم کا گونجتا گرجتا فقرہ سُنائی دیا۔ پھر اور قراتیں چھٹنے لگیں۔ حروفِ حلقی کے بلغم در حلو مخارج نے سامعے کا اُگال دان بھر دیا۔ قرارت کے گھن گرج لب و لہجہ نے کانوں کے حوض پر مینڈکوں کی سبزی منڈی قائم کر دی۔ حاضرین مجلس کی نگاہیں اس پر بھی مُجتہد صاحب کے لبوں پر جمی ہوئی ہیں۔ گویا نگاہوں نے کانوں کے لیے ٹیلیفون کا تار باندھا ہے لفظ لفظ توجہ سے سُن رہے ہیں اور اصلِ مقصود کا اصل خیر سے انتظار ہے۔ اتنے میں تہوّر النسا کا پیارا لفظ سُنائی دیا۔ پھر بنت محمد رحمن چغتائی۔ پھر اَور مراتب۔ وکیل۔ بالنکاح۔ شاہدین۔ عادلین۔ بالغین۔ حُرّین۔ لاکھ۔ روپیہ سکّہ۔ رائج الوقت۔ دینار سُرخ۔ انتظارِ سماعت اب اعلیٰ درجۂ اشتیاق کو پہنچا ہوا ہے۔ مُجتہد صاحب نظیر سے دو بدو ہیں اور نظیر شرمائی ہوئی ترچھی نگاہوں سے اُن کی طرف مخاطب کہ اتنے میں یہ زبردست فقرہ سُننے میں آیا:۔

انکحتک بو کلتے بالصداق المعلوم

نظیر نے اس کے جواب میں کیا کہا معلوم نہیں۔ مگر دیکھا کہ چاروں طرف سے مُبارک باشد مبارک باشد کا غل ہے اور ہر طرف چھُہارے لُٹ رہے ہیں۔